ماہنامہ تجلی دیوبند

تجلی

تاریکیوں میں ایک چراغ

ایڈیٹر:- عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

سالانہ آٹھ روپے

نئے پیسے

کمیونزم کے خدوخال نمایاں کرنے والی کتابیں

عثمان بطور

چین کے مجاہد عثمان بطور اور ان کے ساتھیوں کی ولولہ انگیز سرگزشت جن کے بہادرانہ کارناموں نے اسلام کے دورِ اول کے مجاہدوں کی یاد تازہ کر دی۔ ان مجاہدوں کی سرگزشت جنھوں نے اپنے مذہب اور معاشرے کو الحادی نظم کی یلغار سے بچانے کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیا۔ مترجم شاہد احمد دہلوی۔ ۲۵۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔

آج کا چین

مشہور ہندوستانی عالم ڈاکٹر ایس چندر شیکھر کا سفرنامہ کیمونسٹ چین کی زندگی کے ہر پہلو کا سیر حاصل تجزیہ۔ مترجم مولانا محمد عثمان فارقلیط۔ ۲۰۴ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ

سرگزشتِ امام

چین کے مشہور امام کاؤ ہاؤ جان کی آپ بیتی۔ جو اسلام کی خدمت کرنے مکۂ مکرمہ سے چین گئے اور خدمتِ دین کی پاداش میں کیمونسٹ مظالم کا سامنا کیا۔ مترجم محمد صغیر صاحب مدیر روزنامہ "دعوت" دہلی۔ ۱۰۴ صفحے قیمت ۷۵ پیسے۔

چین کے مسلمان

یہ معلومات افزا کتابچہ چینی مسلمانوں کے تاریخی حالات اور ان کی موجودہ حالت پر روشنی ڈالتا ہے۔ پیش لفظ مولانا محمد عثمان فارقلیط۔ ۶۴ صفحات۔ قیمت ۲۵ پیسے۔

پتھر کے دیوتا

دنیا کے چھ مشہور ادیبوں کی آپ بیتیاں۔ ان آپ بیتیوں میں انھوں نے ان اسباب پر روشنی ڈالی ہے جو کیمونزم پر ایمان لانے کے محرک بنے۔ اس کے بعد انھوں نے اس روحانی کرب کا ذکر کیا ہے جس نے ان کے ایمان میں رخنے ڈال دیے۔ مترجم گوپال متل۔ ۳۰۴ صفحات قیمت ایک روپیہ۔

آزادی کی طرف

ایک ممتاز روسی افسر وکٹر کراف شینکو کی انکشاف انگیز آپ بیتی۔ یہ کتاب جتنی انکشاف انگیز ہے اتنی ہی دل چسپ بھی ہے۔ ایک بار شروع کر کے اسے ختم کیے بغیر آپ ہاتھ سے نہیں رکھیں گے۔ مترجم ستیہ نند شاکر ۴۰۶ صفحات۔ قیمت تین روپے۔

ظلمت نیم روز

ایک ایسے ملک کی لرزہ خیز کہانی جو آدرش وادی انقلابیوں کے ہاتھ میں پڑ کر جنت بنتے بنتے جہنم بن گیا۔ روس کے ایک انقلابی رہنما کی روداد اسیری جس نے اپنی بے گناہی کے باوجود موت کی سزا پائی۔ "اور اقبالِ جرم" کے بعد۔ مترجم گوپال متل۔ ۲۹۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔

اور یانگسی بہتا رہا

دو معصوم دلوں کی کہانی جو سیاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیے گئے۔ جن کے مستقبل کے حسین خوابوں اور بہتر زندگی کی معصومانہ آرزوؤں کو کیمونسٹ حکمرانوں کے تعصبات کا سیل اور غضب ناک یانگسی کی طوفانی لہریں بہا لے گئیں۔ مترجم جلیس عابدی۔ ۲۰۸ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔

آزادی کا ادب

ہندوستان اور پاکستان کے تعمیر پسند شاعروں، افسانہ نگاروں اور ناقدوں کی منتخب تحریریں۔ مرتب گوپال متل۔ قیمت تین روپے۔

ادب میں ترقی پسندی

ترقی پسند تحریک کا بے لاگ تاریخی اور نظریاتی جائزہ، گوپال متل کے قلم سے۔ اپنے موضوع پر پہلی جامع کتاب جس کا ترجمہ کئی غیر ملکی زبانوں میں ہوا۔ ۱۲۸ صفحات قیمت ایک روپیہ۔ انگریزی ایڈیشن دو روپے۔

سورما کی ہار

نیکی اور بدی کی ازلی کشمکش کی خیال افروز داستان موجودہ صدی کا ایک عظیم ناول۔ روسی ادب کا شاہکار مترجم گوپال متل۔ قیمت دو روپے ۵۰ پیسے۔

لینن

انقلاب روس کے بانی نکولائی لینن کی مستند ترین سوانح عمری، لینن سے قریبی ربط رکھنے والے انقلابی ڈیوڈ شوب کے قلم سے۔ مترجم گوپال متل۔ ۲۷۲ صفحات قیمت ایک روپیہ۔

عالمی سیاست میں جمہوریت

بین الاقوامی سیاست میں جمہوریت کے کردار اور جمہوری اصولوں کی کارفرمائی کے امکانات کا سیر حاصل تجزیہ۔ موجودہ عالمی سیاست کے پُرپیچ رجحانات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔ مترجم گوپال متل۔ ۱۱۸ صفحات۔ قیمت ۵۰ پیسے۔

انیس سو چوراسی

جارج آرویل کا عظیم ناول، جس میں بتایا گیا ہے کہ اگر نظامِ جبر کو نہ روکا گیا تو آگے چل کر یہ کتنا ہمہ گیر ہو جائے گا۔ ۱۹۸۴ء میں دنیا کا جو نقشہ ہو سکتا ہے، یہ اس کی بھیانک تصویر ہے۔ مترجم سید سہیل واسطی۔ قیمت دو روپے ۵۰ پیسے۔

اس پتے سے منگائیے: مکتبۂ تجلی۔ دیوبند ضلع سہارن پور (یو۔پی)

ماہنامہ تجلّی دیوبند

جلد نمبر ۱۷ — شمارہ نمبر ۱۱

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت آٹھ روپے۔ فی پرچہ ستّر نئے پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ایک پاؤنڈ بشکل پوسٹل آرڈر

پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھیے بالکل سادہ رکھیے

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سُرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی آٹھ روپے ستر پیسے کا ہوگا)۔ منی آرڈر بھیج کر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

دفتر تجلّی۔ دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

مدیر عامر عثمانی فاضل دیوبند

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند" سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلّی دیوبند سے شائع کیا

آغازِ سخن — عامر عثمانی	۴
کیا ہم مسلمان ہیں؟ — شمس نوید عثمانی	۱۴
تجلّی کی ڈاک — عامر عثمانی	۱۹
تسبیح کے دانے (اقتباسات)	۳۷
شری چھاگلا — بنام امت مسلمہ — عامر عثمانی	۴۳
جمعیۃ علمائے ہند کا ماضی اور حال — جناب عبد الخالق	۵۱
بے لاگ سچائیاں	۶۰
جب اسلام کارفرما تھا — مولانا عبد الرؤف رحمانی	۶۳
مسجد سے میخانے تک — ملّا ابن العرب مکّی	۶۷
آج اور کل — جمیل مہدی	۷۵
باب الصحت — حکیم عظیم زبیری	۸۲

بنامِ جہاندار جاں آفریں

آغازِ سخن

ظلم اور رزق

مشہور کہانی ہے کہ ایک بادشاہ نے کسی باغ میں پہنچکر ایک انار طلب کیا۔ رکھوالے نے تعمیل کردی۔ انار نچوڑا گیا تو عرق سے پیالہ بھر گیا اور شاہ نے اسے نوش کیا تو اس کی لذت اور مہک سے اس کے کام و دہن جھوم اُٹھے۔

کچھ عرصے بعد اسی باغ سے شاہ نے پھر انار طلب کیا۔ اس مرتبہ انار تو اتنا ہی بڑا تھا لیکن اس کے عرق سے پیالہ نہ بھر سکا اور جب اسے نوش کیا گیا تو وہ پہلی جیسی لذت اور مہک بھی شاہ کو محسوس نہ ہوئی۔ اب اس نے باغ والے سے سوال کیا کہ اس نمایاں فرق کی کیا وجہ ہے؟

باغ والا جانتا نہ تھا کہ وہ شاہ سے ہم کلام ہے۔ اس نے بڑے وثوق کے ساتھ جواب دیا ــــ معلوم ہوتا ہے ہمارے بادشاہ کی نیت خراب ہوگئی ہے۔

شاہ چپ چاپ لوٹ آیا۔ اب وہ خاصا فکرمند تھا۔ عالمِ خیال میں جب اس نے ماضی قریب کا جائزہ لیا تو اس کے حافظے کی لوح پر کئی ایسے واقعات اُبھر آئے جو بلاشبہ ظلم پر مبنی تھے۔ اس نے اپنی نیت کا تجزیہ کیا تو وہاں بھی اسے کھوٹ نظر آیا۔ یہ کھوٹ یہی تھا کہ اس سال کچھ نئے ٹیکس لگاتے ہوئے اس نے رعایا کی سکت اور استطاعت کی رعایت ملحوظ رکھنے کے عوض حکومتی اغراض کو فوقیت دی تھی۔

یہ تو خدا جانے کہ پھر کیا ہوا ــــ مگر یہ انسان بھی جانتا ہے کہ مملکت کی مجموعی پیداوار پر کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے بادشاہ کے ظلم اور بدنیتی کا اثر ہوتا ہے اور بُرا ہوتا ہے۔ ظلم کے بُرے نتائج مادی سطح پر خواہ کتنی ہی دیر سے ظاہر ہوں مگر معنوی سطح پر ان کا یہ تلخ ثمرہ بہت جلد مل جاتا ہے کہ غذائی پیداوار میں کمی آتی چلی جاتی ہے۔ مادیت کے ڈسے ہوئے ذہن چاہے نہ مانیں مگر ہم تو تاریخ میں بالکل واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ جب بھی اہلِ تخت و تاج نے ظلم پر کمر باندھی ہے پرجا کے رزق پر قلت اور بے برکتی کے منحوس سائے تھرتھرانے لگے ہیں۔

آج راجوں نوابوں کا دور نہیں۔ ان کی جگہ جمہوری شہزادوں نے لے لی ہے۔ لباس اور ڈھانچے بدل گئے۔ نقشہ اور ہیولیٰ بدل گیا۔ مگر شاہی و خواجگی کی حقیقت تو پھر بھی نہیں بدلی اور یہ قانون بھی نہیں بدلا کہ حکومت ظلم کرے گی تو مملکت کے رزق پر ادبار اور نحوست کے سیاہ بادل ضرور چھائیں گے۔

بات یوں نہیں ہے کہ کسی ملک میں غذائی قلت یا قحط کا ظہور لازماً اس بات کا ثبوت ہو کہ وہاں کی حکومت ظالم ہے۔ قلت یا قحط کا بنیادی سبب کچھ اور بھی ہوسکتا ہے مگر بات یوں ضرور ہے کہ جب بھی کسی حکومت کا ظلم ایک خاص مقدار کو پہنچ گیا ہے وہاں کی غذائی پیداوار

میں نحوست اور بے برکتی کا گھن لگتا چلا گیا ہے۔

اس تمہید کا مقصد آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ آج ہمارا ملک خوفناک غذائی قلت سے دوچار ہے۔ ایسی قلت جس کے عقب میں قحط کا دیو جبڑے کھولے کھڑا ہے ہم اپنی زبان سے یہ الزام دینا نہیں چاہتے کہ اس تشویشناک غذائی قلت کا سبب حکومت کے ظلم اور طغیان کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ الزام سنکر آدمی بھڑک جاتا ہے اور حکومت جن افراد کے مجموعے کا نام ہے وہ بہرحال آدمی ہی ہیں۔ بھڑک جانے کی صورت میں کوئی امکان نہیں کہ عبرت پذیری کا جذبہ ان کے دل و دماغ کو جھنجوڑ سکے۔ ہم بہت ہی عجز اور دل ریشی کے ساتھ بس اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نظم و نسق کی خامیوں، جہد و عمل کی کوتاہیوں اور فکر و تدبر کی نارسائیوں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ کاش ہمارے حکمران اپنے کردار، اپنی فردِ عمل اور اپنی نیتوں کا بھی دیانت دارانہ جائزہ لینے کی زحمت گوارا فرمائیں اور کسی کونے میں تھوڑی دیر مراقبہ کر کے یہ بھی سوچیں کہ جن کروڑوں انسانوں کی باگ ڈور بھگوان نے ان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے ان کے درمیان حق و انصاف کے فیصلے کرنے کی ذمہ داری انھوں نے آزادی کے اٹھارہ سالوں میں دل و جان سے نبھائی ہے یا لاپروائی اور لاگ لپیٹ اور چھل کپٹ کے طور طریق اپنائے ہیں۔ خود تنقیدی بہت مشکل کام ہے مگر یہی کام حیرتناک فتوحات اور کامیابیوں کی کلید بھی ہے۔ دوسروں کی خامیاں ڈھونڈنا اور دوسروں کو خطاوار ٹھیرانا بہت آسان ہے۔ طوق و سلاسل اور بندوق کا استعمال بھی کچھ دشوار نہیں۔ سخت دشوار اور ہمت طلب مرحلہ اگر کوئی ہے تو خود اپنے باطن میں جھانکنا ہے اپنی کوتاہیاں محسوس کرنا ہے۔ اپنے اعمال اور اپنی نیت کا جائزہ لینا ہے۔

آؤ ماضی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں۔ جب امریکہ دریافت نہیں ہوا تھا۔ جب کنیڈا اور آسٹریلیا سے گیہوں کی ایک ننھی کشتی بھی ہندوستان کے ساحل پر نہیں پہنچتی تھی جب دنیا بہت بڑی تھی اور سائنس نے بال و پر نہیں نکالے تھے۔ اس وقت ہمارے دیس میں غلہ بہت تھا۔ کم سے کم اتنا ضرور تھا کہ پیٹوں کے دوزخ باہر کے کسی اَن داتا کی بخشش کے بغیر بھر جاتے تھے۔ کمی اگر کبھی آئی تو محض عارضی اس کے پیچھے بھی عین ممکن ہے کہ حکومتِ وقت کا ظلم ہی کارفرما رہا ہو۔ ظلم اور انصاف اتنے ہی پرانے ہیں جتنا خود انسان۔ کمیونزم کا جدلی فلسفہ اور امپیریلزم کی مادی سائنس ہر واقعے کی جو بھی توجیہ کریں تم تو اسے ہمارے حکمرانو نہ کمیونسٹ ہو نہ کورے امپیریلسٹ۔ تم دھرم اور روحانیت اور ایشور میں وشواس رکھتے ہو تمھیں تو ضرور سوچنا چاہئیے کہ بھارت جیسے وسیع ملک میں زرخیز زمینوں کی بہتات اور قدرتی وسائل کی ریل پیل کے باوجود مستقل غذائی قلت کا عذاب آخر جم کر کیوں رہ گیا ہے — کیا بھگوان کو دوش دوگے یا اپنے گریبان میں جھانکنے کی بھی ہمت کرسکو گے۔

مستقل غذائی قلت کی بات ہم نے غلط نہیں کہی قلت کا احساس آج شدید اور عام اس لئے ہو رہا ہے کہ آج کی دنیا کے سب سے بڑے قارون امریکہ کے مزاج مبارک میں ذرا کھچاؤ اور تغافل کے آثار پیدا ہو چلے ہیں ورنہ قلت تو سالہا سال سے ہے اور قلت کا غار ہر سال باہر سے درآمد کئے ہوئے غلے سے پر کر لیا جاتا ہے۔ تاویلیں کچھ بھی کرو۔ آج وہ نازک گھڑی آپہنچی ہے کہ تاویل کی سائنس بھی شاید ہی کام دے۔ کیا تاویل کروگے اِس بے مہریِ فطرت کی کہ ہر سال ٹوٹ کر برسنے والی گھٹائیں اس سال بھی آئیں مگر دامن سمیٹے گذر گئیں۔ کسانوں کی محنت نے پیاسی زمین کے حلق میں پسینہ نچوڑنے میں بخل نہیں کیا مگر آسمان نے پانی دینے سے انکار کر دیا۔ کتنے ہی مقامات پر جہاں دس من غلہ اگتا تھا وہاں پانچ من اگا اور جہاں گندم بونے کی تیاری تھی وہاں تھک ہار کر چنا بکھیر دینا پڑا۔

جنگ بے شک ہزاروں پریشانیوں کے لئے وجہ جواز

بن سکتی ہے — مگر بارش نہ ہونا تو جنگ کا ثمرہ نہیں ہو سکتا۔ بارش کیوں کم ہوئی۔ اس کا جواب مانسونی منطق میں تلاش کرنے کی بجائے خود اپنے کردار میں ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔ کوری مادیت سے بلند ہو کر اس زاویئے سے سوچو کہ اس پورے دورِ آزادی میں ہماری نیت کا کیا حال رہا ہے۔ ہم نے اچھے اور بُرے کل کارنامے کیا انجام دیئے ہیں۔ ہمارے ہاتھ کی مہندی میں انصاف کا خون کتنا ہے اور کتنے ظلم ہیں جو ہم نے خوبصورت الفاظ اور صداقت نما کذب کی آڑ لے کر خدا کی مخلوق پر روا رکھے ہیں۔

یہ بجا ہے کہ بے شمار قابلِ فخر کارنامے بھی تم اپنے گنوا سکو گے۔ تم نے صنعت و حرفت کے میدان میں بہت کچھ کیا ہے۔ تم نے بڑے بڑے ڈیم بنائے ہیں۔ دیو ہیکل مشینیں نصب کی ہیں۔ سڑکوں کے جال بچھائے ہیں۔ نہریں نکالی ہیں۔ عمارتیں بنائی ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں پوچھتے کہ یہ سب کرنے میں دیس مقروض کتنا ہوا ہے اور آمد و خرچ کے تناسب میں دیانت اور بددیانتی کا میزانیہ کیا رہا ہے۔ ہم تمہارے کارناموں کو بلا بحث و نظر زرّیں مانے لیتے ہیں مگر ان کارناموں کے فخر و غرور سے فارغ ہو کر یہ بھی تو یاد کرنے کی کوشش کرو کہ تم نے دل کتنے توڑے ہیں۔ روحیں کتنی کچلی ہیں۔ گھر کتنے اجاڑے ہیں۔ امنگیں کتنی برباد کی ہیں۔ تمہارے اونچے ایوانوں کی سنگلاخ دیواروں سے فریادیں کتنی سر ٹکرا کر لہولہان لوٹی ہیں اور زخم کتنے تم سے مرہم مانگتے مانگتے ناسور بن گئے ہیں۔

جبلپور۔ ساگر۔ کلکتہ۔ راؤرکیلا — ایسے کتنے ہی نام ہیں جو ہچکیوں اور کراہوں کے ہجوم میں تم سے کچھ کہہ رہے ہیں — عثمانیہ یونیورسٹی — علی گڑھ یونیورسٹی — اُردو زبان — پونا کی مسجدیں — اسکولوں کے نصاب — یہ سب گیا گذرا ہوا — مگر آج ہی کی یہ بالکل تازہ بات کیا ننگے ظلم اور صریح ناانصافی سے کچھ بھی کم ہے کہ جن پانچ کروڑ مسلمانوں نے پاکستان کے مقابلہ میں کسی بھی دیش بھگت سے کم جذبہ نہیں دکھلایا انھیں کے بارے میں دین دیال اور گولوالکر نہیں، وزیر اعظم شاستری جی ڈنکے کی چوٹ فرما رہے ہیں کہ کشمیر اگر پاکستان سے جا ملا تو ان کا کیا ہوگا — !

خوب داد دی ہے عزت مآب وزیر اعظم نے مسلمانوں کی حب الوطنی کی۔ یہ بھیانک قسم کا ظلم نہیں تو کیا ہے کہ کشمیر کو بھارت سے ملائے رکھنے میں ناکام تو ہو خود حکومت اور سزا کی دھمکی دی جائے پانچ کروڑ مسلمانوں کو۔ بعض اہلِ نظر کہتے ہیں کہ وزیر اعظم کے منہ سے یہ بات صرف روا روی میں نکل گئی ان کی نیت میں فتور نہیں تھا۔ — ہو سکتا ہے یہ درست ہی ہو۔ لیکن چند روز قبل حکومت ہی کے ایک اونچے عزت مآب نے ردِّ عمل کی ناپاک منطق کا ذکر اونچے منبروں میں کیا تھا اور ہندو مہا سبھا جیسی جماعتیں تو آئے دن ایسے تذکرے کرتی ہی رہتی ہیں۔ اس سیاق میں وزیر اعظم کے ذہن مبارک پر آئے ہوئے بھیانک فلسفے کو "روا روی" کی رعایت بھی دے لیجئے اور حسن نیت پر بھی ایمان لے آیئے تو یہ سوال بہرحال باقی رہتا ہے کہ روا روی میں ایسی بات موصوف کے منہ سے نکلی کیسے جو جمہوری عدل اور سیکولر دستور کی اسپرٹ اور عدل و دیانت کے سراسر منافی ہے۔ زبان پر آئی ہوئی کوئی بھی بے ساختہ بات ذہن و شعور سے بہرحال ایک مخفی رابطہ رکھتی ہے۔ شدید غصے میں ماں اور بہن کی گالیاں دینے والے اگرچہ بے ساختہ ہی گالی دیتے ہیں اور گالیوں کے واقعاتی مفہوم و مصداق کا ادنیٰ ارادہ بھی ان کے شعور میں موجود نہیں ہوتا مگر یہ لوگ وہی تو ہوتے ہیں جو اپنے گھروں میں اور حلقۂ احباب میں گالیاں بکنے کی عادت رکھتے ہیں۔ گالیاں ان کے لاشعور میں رچ بس جاتی ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص عام حالات میں کبھی گالی نہ بکے اور غصہ آئے تو اچانک گالیوں پر اُتر آئے۔

اسی طرح ردِّ عمل اور انتقام کے جس متعفن فلسفے کو وزیر اعظم

کی زبان پر آجانے کا شرف حاصل ہوا ہے وہ چاہے قصد و شعور کی حد تک "نیک نیتی" ہی سے متصف کیا جا سکے لیکن وہ روا روی میں بھی موصوف کی زبان پر کبھی نہ آتا۔ اگر نارمل حالات میں وہ دو قومی نظریے سے رسم و راہ نہ رکھتے۔ مسلمان اس ملک کے ٹھیک ویسے ہی شہری ہیں جیسے باقی لوگ۔ ان کی ذمہ داریاں اور حقوق کسی بھی فرقے سے کم نہیں۔ یہ نظریہ اگر لاشعور کی گہرائیوں تک نہ پہنچ چکا ہو تو سوتے میں بھی زبان یہ ظالمانہ دھمکی نہیں دہرا سکتی کہ کشمیر مذہب کی بنیاد پر پاکستان میں جا گھسا تو بھارت کے پانچ کروڑ مسلمانوں کی خیریت خطرے میں پڑ جائے گی۔

مقصود شکوہ شکایت نہیں۔ مقصود یہ ثابت کرنا بھی نہیں کہ ہماری جمہوریت اور سیکولرازم بالکل ہی ناکارہ ہیں۔ ناشکری ہوگی اگر یہ اعتراف نہ کیا جائے کہ کانگریسی نیتاؤں کے فکری انتشار اور اعصابی اختلال کے باوجود آئین و دستور کے شاندار معدن سے ہمیں بہت کچھ ملا ہے۔ مگر یہ بات اربابِ حکومت کو نوٹ کر لینی چاہئے کہ ہمارا ملک غذائی اعتبار سے خود کفیل نہیں ہو سکتا جب تک کہ حکمراں گروہ پوری دیانت اور صدق دلی کے ساتھ یہ تہیہ نہ کرلے گا کہ سیاسی اغراض یا مذہبی تعصب یا معاشی مفادات کے چکر میں دیس کے کسی بھی گروہ کے خلاف ظلم و ستم کی روش اختیار نہیں کرے گا۔ عمدہ نظم و نسق، برمحل جدوجہد، بہتر تخم، کافی پانی اور کھاد ـــــ یہ سب تو ضروری ہیں ہی مگر یہ بھی قطعی طور پر ضروری ہے کہ حکمرانوں کی نیت درست ہو اور انصاف کا جذبہ ان کے اقدام و عمل کی روح بن جائے ظلم کو انصاف کہہ کر کمزوروں کا منھ تو بند کیا جا سکتا ہے مگر اُس بھگوان کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا جو بارش برساتا اور غلّہ اُگاتا ہے۔

جمعیۃ علمائے ہند

کسی فرد یا گروہ کو جمعیۃ علمائے ہند کی سیاست اور پالیسیوں سے کیسا ہی اختلاف رہا ہو لیکن جب تک اس جماعت کے رفیع الشان صدر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحؒ زندہ رہے یہ پیشین گوئی کوئی نہیں کر سکتا تھا کہ جمعیۃ کا تنظیمی ڈھانچہ عنقریب کسی بھونچال کی نذر ہونے والا ہے۔ حضرت موصوف کی رحلت کے فوراً بعد بھی ایسی پیشین گوئی مشکل تھی کیونکہ جمعیۃ کے ناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن رحؒ کی اعلیٰ صلاحیتوں کا احساس و اعتراف ان کے دشمن کو بھی تھا۔ لیکن زیادہ گہری نظر رکھنے والوں نے جب دیکھا کہ مولانا مدنی رحؒ کے ارادت مندوں نے ایک ڈرامائی تعجیل کے ساتھ ان کے اس صاحب زادے کو باپ کی خلافت تفویض کر دی ہے جسے خود باپ نے آخر دم تک خلافت کا اہل نہیں سمجھا تھا تو انھوں نے اندازہ لگا لیا کہ اب یہ جاگیردارانہ ذہنیت اُس جمعیۃ علماء کو بھی اپنی لپیٹ میں ضرور لے گی جس کے ڈھانچے کو مولانا حفظ الرحمٰن رحؒ اور ان کے بعض مخلص معاونین کی اہلیت و قابلیت نے سنبھال رکھا ہے۔

یہ اندازہ غلط نہیں نکلا۔ مولانا حفظ الرحمٰن رحؒ کی حیات تک اگرچہ کوئی طوفانی موج سطح پر نہیں اُبھر سکی لیکن حلقہ بند سجادگی نے اندر ہی اندر طوفان کی داغ بیل ڈالنے میں کسر نہیں چھوڑی۔ مولانا مغفور اگر اسی وقت ڈٹ کر مقابلہ کرتے تو عین ممکن تھا کہ طوفان اپنے دہانے میں ہی فنا ہو جاتا مگر وہ شاید اپنی شرافتِ نفس کی وجہ سے صبر و برداشت کے کڑوے گھونٹ حلق سے اُتارتے رہے اس اعصاب شکن صبر و برداشت نے انکی توانائیوں کو کس طرح نچوڑا ہے اس کا ذکر و بیان اشک و آہ کی زبان ہی کر سکتی ہے۔ آخر کار وہ مایوس و دل گرفتہ اس فریب پیشہ اور بے مہر دنیا سے چلے گئے۔ بس ان کا جانا تھا کہ نہ جانے کہاں کہاں خوشی کے چراغ جلے اور پھر میرٹھ کے نام نہاد اجلاس میں کھل کر یہ بات سامنے آ گئی کہ گاڑی اب کس سمت چلے گی۔

کہنے والے جب قسمیں کھا کھا کر بیان کرتے تھے کہ مسندِ صدارت پر ایک خاص بزرگ کو کسی نہ کسی طرح چپکا دینے کا ارادہ رکھنے والے گروہ نے مسلح غنڈوں تک کے اہتمام و انصرام

سے گریز نہیں کیا تو ہم جیسے سادہ لوحوں کو یقین نہیں آتا تھا مگر جب کچھ ہی دنوں بعد اس گروہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قضیے میں بالا بالا رٹ داخل کی اور پھر اس غلط حرکت پر بعض مخلصین نے بجا طور پر جو شکوہ کیا اس کا جواب جس انداز اور لہجے میں اس گروہ نے دیا۔ اس سے یہ بات بڑی حد تک صاف ہو گئی کہ اس گروہ کا مجموعی مذاق و مزاج ہی اس نوع کا ہے جس سے کسی بھی پست حرکت کا صدور بعید نہیں ہے

استاذِ محترم حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولوی اسعد میاں سلّمہ اللہ تعالیٰ ذاتی حیثیت میں کن اوصاف کے مالک ہیں یہ کوئی راز نہیں۔ شجاعت اور سخاوت تو ان کی قابلِ فخر وراثت ہے۔ جہاد و عمل ان کے خون کا جزو ہے۔ اندھا ہی ہوگا جو نہ مانے گا کہ وہ ایک جلیل القدر باپ کے شریف نجیب بیٹے ہیں۔

لیکن المیہ یہ ہے کہ اپنے محترم باپ کی طرح انکی صلاحیتوں کو ایک فطری اور تدریجی ارتقاء کا موقع نہیں ملا بلکہ کچھ لوگوں نے عظمت کا ایک مصنوعی خول ان پر چڑھایا ہے اور وہ ازراہِ سادہ لوحی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ یہ خول مصنوعی نہیں حقیقی اور فطری ہے۔ یہ مضحکہ خیز غلط فہمی اچھے خاصے عقل مندوں کو تماشا بنا سکتی ہے چہ جائیکہ اسعد میاں پھر ان کی موروثی شرافت و نجابت بھی رسوائی کی زد میں ہے کیونکہ جن لوگوں نے ان کی ذات کو مرکز بنا کر اپنے جاہ و اقتدار کا تانا بانا پھیلایا ہے ان کا مجموعی مذاق و مزاج ایسا ہے ہی نہیں جس سے سادات کی عزت اور نیک نامی کی عفت زیادہ عرصہ تک نبھاؤ کر سکے۔ ایسا نظر آتا ہے جیسے مسجد کے صحن میں شرابی جمع ہو گئے ہوں۔ جمعیۃ کی سیاست سے کلی اتفاق نہ رکھنے کے باوجود ہم اس جماعت کے عظیم المرتبہ اسلاف کو گوناگوں خوبیوں کا حامل اور اوصافِ حسنہ کا امانت دار سمجھتے رہے ہیں اور اسی وجہ سے اس جماعت کے معنوی وجود کے لئے مسجد کی تشبیہہ ہمارے لاشعور سے ابھری ہے۔ آج کی صحبت میں جمعیۃ کے تمام مالۂ وما علیہ پر گفتگو مقصود نہیں مگر اختصار کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس گروہ نے سازش، دھاندلی اور ہیر پھیر کے ذریعہ جمعیۃ کی نظامت و صدارت پر قبضہ جمایا ہے اس کا مجموعی ذہن اس کا معیارِ اخلاق اور اس کی افتادِ طبع ایسی مایوس کن ہے کہ اگر ملت کا درد رکھنے والے مخلصین نے مؤثر اصلاحی اقدامات نہ کئے تو نتائج بہت ہی المناک نکلیں گے۔

جمعیۃ کے ورکنگ صدر مولانا مفتی عتیق الرحمان کو اردن کے شاہ نے پانچ ہزار روپے بطور عطیہ جمعیۃ کے لئے دیئے تھے۔ اس کی اطلاع اگلے ہی روز اخبار الجمعیۃ میں شائع کرادی گئی۔ عطیہ دینے کی تقریب یہ تھی کہ صوبہ دہلی کی جمعیۃ کے شعبۂ صنعت نے بیت المال کے تیار کردہ کچھ عربی رومال شاہ کی خدمت میں تحفۃً پیش کئے تھے۔ جسوقت عطیہ حضرت مفتی صاحب کے سپرد کیا گیا یہ توضیح نہیں کی گئی کہ یہ رقم بیت المال ہی کے لئے مخصوص ہے یا جمعیۃ کے دوسرے شعبوں میں بھی خرچ کی جاسکتی ہے۔ مفتی صاحب اسے بطور امانت رکھے رہے اور اسعد میاں کے گروہ کی چلائی ہوئی اندرونی اختلافات کی آندھی اسی زمانے میں اس شدت سے تیز تر ہوتی گئی کہ اس امانت کے بارے میں باہمی مشورت کا مناسب موقع ہی نہ نکل سکا پھر خاصی مدت گذر جانے کے بعد جب مفتی صاحب کو غیر آئینی حرکتوں کے ذریعے "ورکنگ صدارت" سے بے دخل کر دیا گیا تو انھوں نے یہ رقم جمعیۃ کے مرکزی دفتر کو یہ لکھ کر روانہ کر دی کہ اگرچہ صدارت کے معاملے میں ان سے ناانصافی کی گئی ہے لیکن پانچ ہزار کی امانت بہرحال وہ جمعیۃ کے حوالے کر رہے ہیں۔ وصول کر کے رسید دے دی جائے۔ دفتر کی طرف سے جواب ملا کہ اسعد میاں یہاں نہیں ہیں۔ آپ رقم رکھ جائیے باقاعدہ رسید وہی دے سکیں گے۔

ظاہر ہے کہ باقاعدہ رسید کے بغیر اس رقم کو ایسے ہاتھوں میں دیدینا مناسب نہیں تھا جن کی آستین علل و

دیانت کے تازہ تازہ خون سے تر بتر ہو۔ قاصد نے رقم واپس لاکر مفتی صاحب کو دے دی اور مفتی صاحب نے اسے پھر بطور امانت رکھ لیا۔ قدرتاً وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اسعد میاں جب بھی مرکز پہنچیں گے رقم منگوالیں گے مگر اسعد میاں نے کیا پارٹ ادا کیا ـــ یہ ہے وہ المیہ جس پر شرافت آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے اور تہذیب و اخلاق مارے شرم کے سر جھکا لیتے ہیں۔

دفعتاً ۷ر اکتوبر ۶۵ء کے الجمعیۃ میں صفحہ اول پر نہایت نمایاں طور پر مجلس عاملہ کا ایک فیصلہ چھاپ دیا گیا جس کا عنوان اور طرزِ نگارش تو ذہنی خناس اور کبر و نخوت کا آئینہ دار تھا ہی غضب یہ کہ اس میں پوری طوطا چشمی اور سفاکی کے ساتھ "خیانت" کا الزام بھی مفتی صاحب پر عائد کر دیا گیا تھا۔ طوطا چشمی اس لئے کہ مفتی صاحب نے مولانا حفظ الرحمٰن کا دست و بازو بنکر ایک عمر جمعیۃ کی بے لوث خدمت میں صرف کی ہے اور سفاکی اس لئے کہ مفتی صاحب کا بدترین دشمن بھی ان پر ایسے ناروا الزام کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ اسعد میاں کے تو خیر سے ابھی چند روز ہوئے مونچھیں نکلی ہیں، سفید ریش عتیق الرحمٰن کو امتِ مسلمہ کے بے شمار افراد انکی جوانی سے جانتے ہیں۔ وہ ایک کھلی کتاب ہیں۔ ان کے کردار پر کوئی مصنوعی خول نہیں۔ وہ اور جو کچھ بھی ہوں لیکن ان کی دیانت تو عصمتِ مریمؑ کی طرح معروف و مسلّم ہے۔ ان کے بارے میں اس حد تک گر جانے کا تصور کہ محض پانچ ہزار کی بے حیثیت رقم پر رال ٹپکا دیں گے کوئی ایسا ہی آدمی کر سکتا ہے جس کا اپنا ایمان بازار کی جنس ہو۔

چلئے مفتی صاحب کو حسن ظن کی ہر رعایت سے محروم کر دیجئے۔ مان لیتے ہیں کہ وہ نہ کوئی نیکنام آدمی ہیں نہ ان کی کوئی ساکھ ہے۔ عین ممکن ہے کہ فقط ایک روپے پر بھی ان کا ایمان متزلزل ہو ہی جائے۔

لیکن اہل انصاف غور تو کریں کہ دنیا اور دین کا کونسا قانونِ اخلاق اور آئینِ عدل اس ناپاک حرکت کو جواز عطا کر سکتا ہے کہ جمعیۃ کی نام نہاد مجلس عاملہ مفتی صاحب سے پوچھے بغیر خیانت کا فیصلہ کر کے اسے ہاتھوں ہاتھ نہ صرف الجمعیۃ میں بلکہ بعض انگریزی اخباروں میں چھپوا دے۔ مفتی صاحب لندن نہیں چلے گئے تھے۔ وہ اسی دلّی میں موجود تھے جس میں بیٹھ کر مجلس عاملہ کے سفاک اراکین لیلا رچا رہے ہیں۔ مرکز کے جن صاحب نے رقم کی باقاعدہ رسید دینے میں اسعد میاں کی عدم موجودگی کا عذر کیا تھا ممکن نہیں کہ انھوں نے اس واقعے کا تذکرہ ان اراکین سے نہ کیا ہو۔ جب ان اراکین کو معلوم ہو چکا کہ رقم بھیجی گئی تھی تو پھر کیا معنی رکھتا ہے یہ بیہودہ اور رسوا کُن فیصلہ جسے جھٹ پٹ چھاپ دیا گیا ہے۔

اور مان لو نہ بھی معلوم ہوا ہو ـــ تو کیا مجلس عاملہ کے کسی رکن میں انصاف اور شرافت کا یہ ابتدائی احساس بھی موجود نہیں تھا کہ مجلس جمانے اور فیصلہ صادر کرنے سے قبل آٹھ آنے کی رکشا پر بیٹھ کر مفتی صاحب کے گھر تک ہو آئے اور ان سے پوچھ تو لے کہ حضور وہ پانچ ہزار کہاں ہیں۔ پوچھنے کے بعد اگر مفتی صاحب کوئی شافی جواب نہ دیں تبھی کوئی کاروائی کی جائے۔

اگرچہ ثقہ اور سنجیدہ مزاج کی کوئی جماعت تو اس صورت میں بھی جگ ہنسائی اور تذلیل کا یہ ننگِ شرافت طریقہ پسند نہیں کرے گی جب کہ اس کے کسی معزز رکن کی خیانت لاریب طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہو۔ لیکن اتنی ثقاہت و متانت سے جمعیۃ کی نام نہاد مجلس عاملہ اگر تہی دامن تھی تو چلئے اونچے معیار پر لعنت بھیجئے۔ مگر یہ تو صریح ظلم اور کینہ پروری ہوئی کہ جس نیک نام اور ذی حیثیت فرد پر ڈنکے کی چوٹ الزام لگانے چلے ہیں اس سے پوچھنے تک کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی کہ تم اپنی پوزیشن کے بارے میں کیا کہتے ہو۔

واقعہ دراصل اس کے سوا کچھ تھا ہی نہیں کہ مفتی عتیق الرحمان صاحب کو ورکنگ صدارت کے عہدے سے ہٹانے کا جو ڈرامہ کھیلا گیا تھا اس کے رکیک پہلوؤں سے اہل نظر

کی توجہ ہٹانے کے لئے ڈرامے کے ایکٹروں کو ایک نئے موضوع گفتگو کی تلاش تھی اور یہ موضوع اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا کہ جس ہستی کو جعل و دغا کا نشانہ بنایا گیا الٹی اسی کی دیانت بحث و جدل کا ہدف بنا دی جائے۔ کوشش کی گئی کہ امانت وصول کرنے سے قبل ہی برق رفتاری کے ساتھ خیانت کا ڈھول پیٹ جائے۔ منصف مزاج حضرات انصاف فرمائیں کہ اس شیطنت کا نام اگر انصاف ہے تو بے انصافی کسے کہتے ہیں —؟

طرفہ تماشا یہ کہ مجلس عاملہ کے اسی ناپاک فیصلے میں ناظم عمومی صاحب کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ مفتی صاحب سے جواب طلب کریں۔ واہ رے مسخرو۔ فیصلہ پہلے کر دیا اور جواب طلبی بعد میں ہوگی۔ ایسا اندھیر بھی دنیا نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ پھر رذالت کی انتہا ہے کہ جواب طلبی کی خدمت سپرد کی گئی ناظم عمومی جناب اسعد میاں کو حالانکہ اگر اس لایعنی جواب طلبی کے کوئی برے بھلے معنی ہی تھے تو یہ خدمت مولٰنا فخر الدین کے سپرد کی جا سکتی تھی۔ وہ نام ہی کے صدر سہی مگر اپنی کبر سنی اور ریشِ دراز کی مناسبت سے مفتی صاحب سے جواب طلبی کرتے ہوئے اچھے تو لگتے مگر ایسا نہیں کیا گیا کیونکہ مفتی صاحب کی زیادہ سے زیادہ تذلیل اصل مقصود تھا اور ظاہر ہے کہ یہ مقصود خاطر خواہ طور پر اسی طرح حاصل ہو سکتا تھا کہ شیخ کی داڑھی کوئی چھوکرا کھینچے اور دراز قد ورکنگ صدر کی پیمائش بالشتیوں سے کرائی جائے۔

یہ ایک ہی کارنامہ قابض گروہ کے معیارِ اخلاق اور ذہنی سطح کا اندازہ کرنے کے لئے بہت کافی کہا جا سکتا ہے مگر لگے ہاتھوں ہم اُس افتراق انگیز فیصلے کا ذکر بھی کریں گے جس میں اس گروہ نے شرکائے جمعیۃ کے لئے "مجلس مشاورت" کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا ہے۔ یہ فیصلہ ایک طرف غیر معمولی انانیت کا مظہر ہے دوسری طرف کانگریسی حکومت کے رُخ پر اس کا انداز "خان بہادری" والی ذہنیت کا ہے تیسری طرف اس میں اپنے سوا دوسرے تمام ہم سفیروں پر طنز و افترا کیا گیا ہے۔

سخت حیرت ہوتی ہے جب ہم الجمعیۃ کے فاضل مدیر جناب عثمان فارقلیط جیسے انصاف پسند اور دیدہ ور کو ۸ نومبر کے شذرات میں بڑی معصومیت کے ساتھ یہ لکھتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ مجلس مشاورت سے کامل انقطاع کا یہ فیصلہ تو جمعیۃ نے دراصل اتحادِ فکر کی خاطر کیا ہے۔ اس کا مقصود ملّی اتحاد کی حفاظت ہے اور۔

"مجلس عاملہ نے مجلس مشاورت کی خدمات سے کوئی تعرض نہیں کیا اور نہ اس کے ساتھ ملت کے تعلق پر بحث کی صرف اپنے ارکان کی شمولیت پر پابندی لگائی۔ یہ حق بہر حال ایسا ہے جسے سلب نہ ہونا چاہئے"

اسے کہتے ہیں عین دوپہر میں سورج کی تردید! — اور یہی ہے اس فارسی ضرب المثل کا مصداق کہ دروغ گویم بر روئے تو۔ — اس فیصلے میں جمعیۃ کے مٹھی بھر قابض گروہ کے علاوہ مسلمانوں کی باقی قابل ذکر جماعتوں اور سیاسی شخصیتوں کو جس طعن و افترا کا نشانہ بنایا گیا ہے اس کی تشریح تو خود اسعد میاں اپنے اس مکتوب میں خاصی بے تکلفی کے ساتھ کرتے ہیں جس میں ہمارے کہنہ سال اور تجربہ کار قومی رہنما جناب ڈاکٹر سید محمود کو خطاب کیا گیا ہے۔ اسعد میاں کے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

"میں بڑے دکھ کے ساتھ اپنے اس احساس کو آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ مجلس مشاورت کے موجودہ کردار اور طرزِ عمل سے ۴۷ء سے پہلے کی فرقہ وارانہ مسلم سیاست کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے آپ کو یاد ہوگا کہ اس وقت تقسیم ملک کی حمایت کے لئے جس قسم کے افراد اور جن جماعتوں کا متحدہ محاذ وجود میں لایا گیا تھا آج بھی اسی قسم کے افراد اور وہی جماعتیں مسلم مجلس مشاورت کے پردے میں ملکی و ملی سیاست پر غالب آنے کی تدبیریں کر رہی ہیں"

اس سے بڑا اور شر انگیز الزام اسعد میاں مجلس مشاورت کے شرکا پر لگا بھی کیا سکتے تھے۔ چوری، ڈکیتی، رشوت ستانی حتیٰ کہ قتل کا الزام بھی برادرانِ وطن کو اشتعال دلانے میں اتنا کارگر اور سریع الاثر نہیں ہو سکتا جتنا یہ الزام

کہ فلاں فلاں مسلم افراد اور جماعتوں نے سیکولرازم، قومی یک جہتی اور نام نہاد جمہوریت کے خلاف گٹھ جوڑ کیا ہے۔

پھر مجلس مشاورت کے خلاف — یعنی مسلمانوں کی تمام قابل ذکر سیاسی جماعتوں اور قومی شخصیتوں کے خلاف اکثریت کو چڑھ دوڑنے کی شہ دینے کی خدمت اسعد میاں نے ان واشگاف الفاظ میں انجام دی :-

"ہندو پاکستان کی جنگ کے دوران آپ نے اگرچہ ذاتی طور پر اپنی خدمات محاذ جنگ کے لئے پیش فرمائیں۔ مگر مجھے تعجب اور حیرت ہے کہ اس سلسلے میں مسلم مجلس مشاورت نے معمولی توجہ دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور اس اہم اور نازک موقع پر مجلس کا کوئی اجلاس بھی طلب نہیں کیا گیا حالانکہ اس سے پہلے معمولی معمولی باتوں پر اجلاس طلب کئے گئے ہیں۔"

دیکھا آپ نے۔ مجلس عاملہ کے مذکرہ فیصلے کی مستند شرح یہ ہے مگر الجمعیۃ کے فاضل مدیر یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہ فیصلہ تو بہت معصومانہ، بے حد سنجیدہ، یکسر تعمیری اور ملّی اتحاد کے مقدس جذبے پر مبنی تھا —!

اسعد میاں کے توضیحی خط کا مفصّل اور تشفی بخش جواب ڈاکٹر سید محمود کی طرف سے پریس میں آچکا ہے۔ اس کے بعد ہمارے کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ فقط ایک نکتہ ہم اہل نظر کے آگے رکھ دیتے ہیں کہ جب دورانِ جنگ میں ہمارا قومی ریڈیو اور ہمارے اخبارات شد و مد کے ساتھ مسلسل یہ باور کرا رہے تھے کہ ہم جیت رہے ہیں دشمن ہار رہا ہے۔ ہم پیٹ رہے ہیں دشمن پٹ رہا ہے۔ ہم فاتح ہیں دشمن مفتوح — ہم غالب ہیں دشمن مغلوب۔ ہم دشمن کے ہتھیاروں کو روئی کی طرح دُھنک رہے ہیں۔ اس کے سپاہیوں کو مچھر مکھی کی طرح مسل رہے ہیں۔ ہمارا ہر قدم آگے ہی آگے ہے۔ ہمارا ایک جوان دشمن کے بیس بیس جوانوں پر لرزہ طاری کئے ہوئے ہے لڑائی تمام تر دشمن ہی کے گھر میں لڑی جا رہی ہے اور کچھ بعید نہیں کہ اگلے ہی لمحے ہم دشمن پر آخری فیصلہ کن ضرب لگاکر فتح کامل کا بینڈ بجادیں۔

تو اس اطمینان بخش، مسرت انگیز اور حوصلہ افزا پبلسٹی کے ماحول میں معقول اور مناسب بات یہ کیسے ہوتی کہ مجلس مشاورت کے شرکاء خواہ مخواہ حالات کو نازک قرار دے کر اجلاس کرنے بیٹھ جاتے اور بے محل طور پر ایک ایسا ڈرامہ اسٹیج کرتے جسے حب الوطنی کی نمائش اور وفاداری کے ڈھونگ سے زیادہ کوئی عنوان نہ دیا جاسکتا۔ اس ماحول میں تو بالکل طبعی اور مناسب اور نفسیات کے عین مطابق بات یہی تھی کہ وہ اپنی اپنی جگہ مطمئن بیٹھ کر بس یہ انتظار کرتے رہتے کہ اب آئی دشمن کے ہتھیار ڈالنے کی خوشخبری۔ اب آیا لاہور اور سیالکوٹ کے سقوط کا مژدہ۔ اب کی مسٹر ایوب نے فرطِ یاس میں خودکشی اور اب طلوع ہوئی مسٹر بھٹو کے ہونٹوں پر نزع کی ہچکی — یہی انھوں نے کیا بھی!

معلوم ہوتا ہے مولوی اسعد میاں دورانِ جنگ میں پابندی سے پاکستان ریڈیو سُنتے رہے ہیں اور اپنے قومی ریڈیو کی صداقت پر ایمان رکھنے کے عوض دشمن کے غیر قومی ریڈیو نے ان کے دل و دماغ کو غیر معمولی طور پر متأثر کیا ہے اسی لئے انھیں حالات کی کسی ایسی مخفی نزاکت و اہمیت کا احساس ہو گیا جس میں بیچاری مجلس مشاورت جیسی نومولود جماعت کا اجلاس بھی کوئی معنی رکھتا ورنہ اپنی بہادر فوجوں کی مسلسل پیش قدمی، شاندار کامیابی اور فیصلہ کن برتری کی گونج میں ایسے کسی لغو ولایعنی اجلاس کا تصور بھی کیونکر پیدا ہو سکتا تھا۔ تصور کا پیدا ہونا پھر اسے مستقل اعتراض و طعن کی شکل میں پیش کر دینا واضح قرینہ ہے کہ قوم پرستی اور وطن دوستی کے بلند بانگ مدعی اسعد میاں آل انڈیا ریڈیو سے زیادہ پاکستان ریڈیو کو سچا سمجھتے رہے ہیں۔

اور اگر یہ بات نہیں تو پھر طعن نما حیرت اور اعتراض نما تعجب کا مطلب یہ ہوگا کہ اسعد میاں کے نزدیک مجلس مشاورت کے شرکاء کو عین اُس وقت بھی حب الوطنی اور

قومِ پروری کا ڈھونگ رچانا چاہیئے تھا جب اس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

حقیقت جو کچھ بھی ہو۔ یہ ایک بات بالکل صاف ہے کہ اپنے خط کے منقولہ فقروں میں اسعد میاں نے اکثریت کی جارحانہ قوم پرستی کے لئے ایک تازہ نشانہ تجویز فرمادیا ہے

ایک سوال اسعد میاں سے یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ "مجلس مشاورت" میں سب سے زیادہ نمائندگی تو حضور کی جمعیۃ علماء ہی کو حاصل تھی۔ بچاری جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے تو بس دو نمائندے شریک ہیں جمعیۃ کے خیر سے اکٹھے سات نمائندے شامل تھے۔ ان ساتوں میں ایک بھی مفتی عتیق الرحمان کا نامزد کردہ نہیں، بلکہ جناب ہی نے ان کی فہرست ڈاکٹر محمود صاحب کو دی تھی۔ گویا یہ سب آپ ہی کے منتخب کردہ تھے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان ساتوں نے دورانِ جنگ میں کسی اجلاس کی تحریک کی تھی؟

اگر کی تھی اور مجلس مشاورت کے باقی اراکین نے اسے رد کردیا تھا تب تو اعتراض اور تحیّر کا موقع نکلتا ہے۔ لیکن اگر نہیں کی تھی —— اور یقیناً نہیں کی تھی تو اجلاس نہ کرنے اور بے توجہی برتنے کا جو اعتراض اسعد میاں نے کیا ہے اس کا سب سے بڑھ کر نشانہ تو خود وہ اور ان کے یہ ساتوں کارندے بنتے ہیں۔ یہ خود سوتے رہے اور الزام دیا جارہا ہے ان جاگنے والوں کو جو اپنے قومی ریڈیو کی خبریں سننے اور ان پر بھروسہ کرنے کے نتیجے میں جشنِ مسرت منانے کے علاوہ کسی اجلاس کا تصور ہی نہیں کرسکتے تھے۔

سچ یہ ہے کہ حشم یار کی شہ پر اسعد میاں کو مجلس مشاورت سے ترکِ تعلق بہرحال کرنا تھا۔ اس کا جواز مجلس کو جرم میں شریک قرار دیئے بغیر کیسے پیدا ہوتا۔ ترکِ تعلق کا ارادہ تو اسی وقت کرلیا گیا تھا جب دہلی میں ایک مقابلے کے کنونشن کی لیلا رچائی گئی تھی۔ تکمیل اب ہوئی اور تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ جتنے بھی الزامات و اعتراضات تصنیف کیئے جاسکیں کردیئے جائیں۔ ورنہ یہ بات تو بالکل سامنے کی ہے کہ دورانِ جنگ میں اجلاس کرنے کی کوئی معقول وجہ اگر موجود ہوتی تو خود اسعد میاں اور ان کے سات ہرکارے اس کی تحریک فرماتے۔

دین وملّت کا کون بہی خواہ ایسا ہوگا جو یہ آرزو نہ کرے گا کہ جمعیۃ کا اندرونی انتشار وخلفشار جلد سے جلد ختم ہو۔ ہم خود قلب وروح کی گہرائیوں کے ساتھ یہی تمنا رکھتے ہیں لیکن یہ تمنا پوری اس لئے ہوتی نظر نہیں آتی کہ خلفشار کی بنیاد کسی غلط فہمی پر نہیں ہے۔ غلط فہمیاں تو بہرحال کسی نہ کسی طرح دور کی ہی جاسکتی ہیں لیکن جس خلفشار کی بنیاد ایک گروہ کی اقتدار طلبی اور مطلق العنانی پر ہو اس کا خاتمہ افہام وتفہیم سے نہیں ہوسکتا جب تک کہ دوسرا گروہ خطِ غلامی ہی نہ لکھدے۔ دوسرا گروہ شاید خاموش بھی ہو بیٹھتا کیونکہ اس کی باگ ڈور جن سربراہوں کے ہاتھوں میں ہے وہ حبِّ جاہ اور اقتدار پسندی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ لیکن ان کے سینوں میں دین وملّت کی خیرخواہی اور قوم وملک کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس چونکہ فنا نہیں ہوا ہے اس لئے وہ آسانی سے یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ امت کی بھیڑیں ایسے چرواہوں کے رحم وکرم پر چھوڑدی جائیں جو ان بے زبان بھیڑوں کو اپنی ہوسِ اقتدار کی بھٹی کا ایندھن بنانے میں شمّہ برابر تامل اور ترحم سے کام نہیں لیں گے۔ اسی لئے یہ مجروح ومظلوم گروہ ماہِ رواں (نومبر ۶۵ء) کے اواخر میں بھوپال میں جمع ہورہا ہے جہاں یہ سر جوڑ کر غور کرے گا کہ موجودہ صورتِ حال سے کیونکر نمٹا جائے اور اصلاحِ احوال کے لئے کونسے قدم اٹھائے جائیں۔

کرگس کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن

یہ بات کسی ان پڑھ مسلمان سے بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے لئے دعائے مغفرت نہیں کی جاسکتی۔ حد ہے کہ سب سے بڑے پیغمبر خاتم الانبیاء شافع محشر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہِ ربّانی سے اپنے والدین کیلئے دعائے مغفرت

کی اجازت نہ مل سکی۔

اور یہ بات بھی سبھی مسلمان جانتے ہیں کہ مسلمان ہونے کے لئے دو لازمی شرطیں ہیں۔ دلی تصدیق اور زبانی اعتراف۔ کوئی شخص قلبی طور پر کچھ بھی اعتقادات رکھتا ہو لیکن جب تک وہ یہ اقرار نہ کرے گا کہ میں مسلمان ہوں اسے مسلمان نہیں مانا جائے گا۔

ان مسلّمات کی روشنی میں ذرا وہ تعزیت نامہ ملاحظہ فرمایئے جو اسعد میاں نے علامہ پنڈت ترِبھون ناتھ زتشی آزاد کی موت پر ان کے صاحبزادے کو ارسال کیا ہے:۔

"حضرت علامہ پنڈت زار دہلوی یادگار داغ علم و فن کے علیم اور تہذیب و رواداری کی ایک صدی کی روایات کے حامل اور بزرگانِ عہد کے اسوۂ حسنہ کے مظہر تھے اللہ تعالیٰ ان کی **مغفرت** فرمائے۔ ان کی حمد و نعت گوئی اور توحید پرستی کا ڈنکا بجتا تھا۔ میں بھی دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے اور آپ کو اُن کے ادبی ورثہ کی جانشینی جس کے آپ مستحق ہیں سرگرمی سے کارکردگی کی توفیق عطا فرمائے"۔۔۔ (روزنامہ الجمعیۃ ۱۰ نومبر ۶۵ء)

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آنجہانی زار آزاد بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ انھوں نے نعتیں بھی کہی ہیں اور توحید سے بھی انھیں شغف رہا ہے۔ انھوں نے اُردو، فارسی اور عربی بھی پڑھی ہے۔ ان کے تعلیمی، تعلّمی اور نوع بہ نوع سماجی روابط مسلمانوں سے بڑے گہرے رہے ہیں۔ مگر کیا ایسے ہزار اوصاف بھی کسی شخص کو دعائے مغفرت کا مستحق بنا سکتے ہیں جب تک کہ وہ اپنی ملّت سے انقطاع اور ملّتِ اسلامیہ میں شمولیت کا صاف صاف اعلان و اقرار نہ کرے۔

ہم نے ذہنی طور پر بہت کوشش کی کہ اسعد میاں کے حق میں کوئی تاویل نکل آئے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اب سوال خود موصوف ہی کے جواب دینے کا ہے کہ قرآن و حدیث کے متفق علیہ، محکم، قطعی اور معلوم و معروف عقیدے کے برعکس انھوں نے آنجہانی زار آزاد زتشی کے لئے صریح الفاظ میں دعائے مغفرت کس بنیاد پر کی ہے اور یہ جسارت اللہ اور رسولؐ کے بالمقابل مکابرہ اور مجادلہ نہیں کہلائے گی تو اور کیا کہلائے گی؟ — کہیں ایسا تو نہیں کہ جس درجے اور معیار کی قومی یک جہتی اور سیکولرازم اور وطن پرستی کو انھوں نے منزلِ مقصود بنایا ہے اسی کا ایک نمونہ یہ بھی ہو اور اگلے مرحلے میں وہ کسی غیر مسلم میت کی نماز جنازہ بھی پڑھنے میں تکلف نہ فرمائیں۔ ایسا اگر ہے تو پھر ان کے مریدانِ سادہ لوح کو غور کر لینا چاہیئے کہ جس جنت تک وہ صاحبزادے کے پیچھے پیچھے پہنچنا چاہتے ہیں کہ وہ کہیں احمقوں کی "جنت" تو نہیں۔۔!

مولٰنا آزادؒ کے خطوط

ساہتیہ اکیڈیمی مولانا آزادؒ کی تمام تحریریں حسنِ اہتمام سے شائع کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ ان میں ایک جلد ان کے خطوط کی ہوگی۔ جن اصحاب کے پاس ان کے خطوط۔ یا ایک بھی خط ہو وہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھیج کر شکریے کا موقع دیں۔ اصل یا نقل۔ اصل کی صورت میں نقل لے کر یہ اصل واپس کر دی جائے گی۔ آپ کا پیشگی شکریہ۔

مالک رام۔ ساہتیہ اکیڈیمی۔ رابندر بھون —
۳۵۔ فیروز شاہ روڈ۔ نئی دہلی ۱۔

یوم الفرقان یعنی شہدائے بدر

کفر و اسلام کے پہلے حیرتناک معرکے — معرکۂ بدر — میں شہادت پانے والے صحابہؓ کا تعارف۔ انکے فضائل و محاسن، معرکے کی تفصیلات اور اعجاز قدرت کی جھلکیاں

قیمت ۵۰ نئے پیسے

مکتبہ تجلّی۔ دیوبند (یو۔پی)

شمس نوید عثمانی

مستقل عنوان

کیا ہم مسلمان ہیں؟

"ایمان" — ایک سخت آزمائش۔ ایک عظیم کامیابی

حضرت بلالؓ بن رباح مسلمان ہونے سے پہلے محض ایک حبشی غلام ہی تو تھے —— ایک بے حیثیت وجود جسکی دُکھ بھری زندگی اس وقت تک ہر لحاظ سے ایک سیاہ رات تھی۔ انسانی غلامی کے اس دور میں ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی تو نہیں!

سراپا اخلاص و وفاداری ——

ہمہ تن بیچارگی و بے بسی ——

متاعِ دنیا اور دولتِ ظاہری سے یکسر خالی ہاتھ! ——

مگر یہ بات اس وقت تک کی ہے جب تک وہ ایک آدمی کے غلام تھے۔ اُمیّہ بن خلف جیسا کافر و مشرک انکے اوپر آقائی کر رہا تھا جس کی آقائیت بلالؓ بن رباح کو دو روٹیوں اور دو چیتھڑوں کے عوض ان سے ان کی ساری انسانیت کے شرف خرید لینا چاہتی تھی۔ لیکن یہ المیہ کوئی نئی بات نہیں —— باطل کی آقائی نے تو ہمیشہ یہی کھیل کھیلا ہے —— ہمیشہ یہی کھیل کھیلتی رہے گی۔ خدا فراموش انسانی غلامی کی رسم نے خدا کے بندوں کو اسی طرح لوٹا ہے —— ہمیشہ اسی طرح لوٹا ہے۔

زندگی کے اسی خوں چکاں دور میں بلالؓ نے محمدؐ کی نئی آواز سُنی!

"خدا کے سوا کوئی اور خدا نہیں"۔

کربِ غلامی سے گھائل روح کو اس آواز نے چونکا دیا۔ جھنجوڑ ڈالا! ——

انھیں پہلی بار اس حقیقت کا سنسنی خیز احساس ہوا کہ آقا اُمیّہ بن خلف اور غلام بلالؓ بن رباح دونوں برابر ہیں۔ دونوں غلام ہیں —— ایک ہی خدا کے غلام! ——

اس احساسِ حقیقت نے بلالؓ کی روح میں ایک طرف عبودیت کا سوزِ بیکراں بھر دیا' دوسری طرف غیرتِ انسانیت کے شعلے کوٹ دیئے۔ یہ آوازِ یقین و ایمان کی برقی لہر کی طرح آئی۔ ان کے قلب و روح میں سرایت کر گئی اور ٹھیک اسیوقت جب وہ اپنے خدا کے قدموں پر جھک رہے تھے ان کے جسم و جاں بندوں کی بندگی اور غلاموں کی غلامی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بیزار اور آزاد ہو رہے تھے۔ سر سے پاؤں تک غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا انسان بے اختیار پکار اٹھا اور "غلامی" کی تمام زنجیریں چھن چھنا کر ٹوٹ گریں۔

"خدا کے سوا کوئی اور خدا ہے ہی نہیں —— نہیں ہے —— ہرگز نہیں ہے"۔

اور ——

اسی دم وہ آدمی جو ایک حبشی غلام تھا ان لوگوں کے لئے "سیّدنا بلالؓ" ہو گیا جن کے سینے روشن اور آنکھیں بھیگی بھیگی تھیں۔

"خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں!"

ہائے یہ الفاظ! —— یہ چند لفظ!!

کیا یہ محض چند کھوکھلے لفظ ہیں جو زبان کی چند جنبشوں سے بن جاتے اور ہوا کے ایک جھونکے سے تحلیل ہو کر فنا

ہو جاتے ہیں؟ اگر واقعی ایسا ہی ہوتا تو پھر ایسا کبھی نہ ہوتا کہ ان الفاظ پر خونِ حیات کا ایک ایک قطرہ ٹپکا دینے' دل کی ایک ایک دھڑکن لٹا دینے اور عمر کا آخری سانس تک نذر کر دینے کے بعد بھی ان الفاظ کو منہ سے نکالنے والے یہ کہتے ہوئے دنیا سے جاتے کہ ہم سے ان الفاظ کا حق ادا نہیں ہوا۔ کیسے ہوش باختہ ہیں وہ دیوانے جو اس خوفناک دھوکے کے سہارے جینا چاہتے ہیں کہ ہمیں بس اتنا کہنے پر ہی چھوڑ دیا جائے گا کہ "ہم ایمان لے آئے" اور ہمیں کسی آزمائش میں ڈالا نہ جائے گا!

بلالؓ نے یوں نہیں سوچا تھا۔ انھوں نے بستر پر لیٹ کر نہیں، جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ کلمہ پڑھا تھا اور اسی لئے انکو خدا نے خوب خوب ہی آزمایا اور پھر اس کے بعد خوب ہی نوازا بھی "حبشی غلام" کے بجائے "سیدنا بلالؓ" بننے سے پہلے ۔۔

۔۔ اس سے پہلے کہ جنت یہ آرزو کرتی کہ اس مشتِ خاک کے قدم میرے فرش لالہ و گل پر پڑیں۔ بلالؓ کو سالہا سال تک انسانی عقوبت کے کانٹوں پر گھسیٹا گیا اور شعلہ بار ریت میں ڈال ڈال کر بے رحمی کی ٹھوکروں سے روندا گیا۔ یقیناً یہ ایک بہت ہی بڑی عقوبت تھی۔ مگر اس سے بھی بڑی تھی وہ ایک گھٹی گھٹی چیخ جو اس وقت بھی بلالؓ کے خشک اور جلتے ہوئے ہونٹوں سے بلند ہوتی تھی جب ظلم و جبر کی مسلسل یلغار میں انکی زندگی کی جاں کنی سکراتِ موت سے بھی آگے نکل جاتی تھی۔

"خدا ایک ہے ۔۔۔ مجھے مار ڈالو مگر خدا ایک ہے ۔۔۔ احد ۔۔۔ وحدہٗ لاشریک!"

ظلم و ستم کے ان مسلسل زلزلوں میں بلالؓ کو تہ و بالا ہوتا ہوا دیکھ کر کوئی یہ بھی تصور نہ کر سکتا تھا کہ یہ جان لیوا عقوبت ان کو جیتا بھی چھوڑ سکے گی ۔۔۔ پھر یہ کوئی کیسے تصور کرتا کہ جس ظالم آقا کے ہاتھ دن دہاڑے مکے کی سڑکوں پر بلالؓ کا گلا گھونٹ ڈالنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اسی "آقا" کو ایک دن اپنے اسی غلام کے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپنا ہوگا! ۔۔۔ اور زندگی کے طوفان میں اسی "غلام" کی گھٹی گھٹی ہی آواز ایک دن خانہ کعبہ کی چھت سے اذان کا رجز بن کر اٹھے گی تو خدا کے عرش کو چھو لے گی۔

بھلا کون تصور کر سکتا تھا!

مگر خدا کی قسم! ۔۔۔ واقعات یوں ہی پیش آئے۔ حالات و امکانات کے علی الرغم پیش آئے۔ حالات و امکانات کی بساط اُلٹ گئی اور خدا کی تقدیر نے تاریخ کے چوراہے پر کھڑے ہو کر ثابت کیا کہ بلالؓ اسی خدا کا غلام ہے جو خدا جس بات کا ارادہ کر لے تو پھر وہ ہو کر ہی رہتی ہے۔

کفر و اسلام کی پہلی ہی جنگ میں خدا نے اُمیّہ بن خلف کی گردن کو بلال حبشیؓ کی تلوار کے حوالے کر دیا تھا ۔۔۔ اور فتح مکہ کی عہد آفریں مہم میں محمد عربی اور بلالؓ حبشی ایک ہی ناقہ پر ایک ساتھ سوار تھے اور جب بڑے بڑے مومن کعبہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو کعبہ کی چھت سے پہلی اذان بلند کرانے کے لئے اللہ کی رحمت اور محمدؐ کی نظر اسی سیاہ فام حبشی غلام کو سرخ و سفید اَن گنت چہروں کے درمیان ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ کفر و شرک نے جس بلالؓ کو قدموں سے روند ڈالنے کی کوشش کی تھی اسلام نے اسی بلالؓ ۔۔۔ اسی حبشی غلام کو "سیّدنا بلالؓ" بنا کر اٹھایا ۔۔۔ کعبے کی چھت تک پہنچایا اور اس کے سیاہ ہونٹوں کو اس فخرِ عظیم کے لئے چن لیا کہ کعبے کی پہلی اذان انھیں پر ایک شعلۂ نور بن کر لرزے۔ ایک موجۂ نور بن کر پھوٹے اور ہمیشہ کے لئے فضاؤں اور سینوں میں رواں دواں رہے۔ آج بھی جب روح کے غرفے سے پرانی یادوں کی نسیم قلب و ذہن کی وادیوں میں داخل ہوتی ہے تو ایک نغمۂ نور نس نس میں بکھرتا چلا جاتا ہے جس کا سرمدی آہنگ دل کی دھڑکنوں میں جذب ہو کر احساس دلاتا ہے کہ بلالؓ کی صدائے اذان مشرق سے مغرب تک جوئے رواں کی طرح بہہ رہی ہے۔ بہہ رہی ہے اور بہتی رہے گی وہ فقط ایک صدا نہیں تھی۔ لفظوں میں ڈھلی ہوئی روحِ بلالؓ تھی جو رہتی دنیا تک فضائے بسیط میں چمکتی رہے گی۔

کیسے تھے وہ لوگ جنھوں نے جی اور جان سے حق و صداقت کی قیمت پہچانی! ہمیشہ ہمیشہ خوشی سے جینے کیلئے اس دنیا ۔۔۔ ہاں اس دنیا میں سسکتے رہنا بھی ان کے لئے

ایک کھیل تھا۔ انھیں تو آزمائش کی سنگلاخ گھاٹیوں سے جنت کے باغوں کی خوشبو آتی تھی ۔۔ اپنے اشک و خوں کی طغیانی میں اس یقین کے سہارے تھپیڑے کھا کھا کر وہ مسکرا سکتے تھے کہ اس طغیانی کے اُس پار ایک ساحلِ مراد بھی ہے ۔۔۔ جہاں خدا اور خدا کی جنت نہ جانے کب سے ان کے منتظر و مشتاق ہیں۔

۔۔۔ اور کیسے ہیں وہ لوگ جو خدا کی جنت کو مفت میں حاصل کرنے کی آرزو بھی اس طرح نہیں کرتے جس طرح سچ مچ کسی چیز کی آرزو کی جاتی ہے!۔

دامنِ رسالتؐ میں

حضرت ثوبانؓ مکّے کے ایک کافر آقا کے غلام تھے ۔۔۔ لیکن کتنا شاندار تھا وہ "غلام" جس کی روح آزاد تھی!۔ غلامی سے کچلے ہوئے جسم تک جوں ہی یہ صدائے حقیقت پہنچی کہ انسان ایک خدا کے سوا کسی کا بھی غلام نہیں تو ثوبانؓ نے اسی لمحے اس حقیقت کی دل سے تصدیق کی اور زبان سے اس کا اعلان بھی کر دیا ۔۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس حقیقت کو زبان پر لانے کا انجام کیا ہوگا ۔۔ وہ اس سے بے خبر بھی نہیں تھے کہ جن لوگوں نے یہ سچی بات مان کر اس کا اعلان کر دیا تھا ان کو اس حقیقت کے بے رحم دشمنوں نے کس طرح آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ ان مظالم کی ہولناکیاں ان کی آنکھوں کے سامنے تھیں۔ ان مظلوموں کی دردناک چیخوں کی آواز ان کے کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہی تھی ۔۔ لیکن پھر بھی وہ ڈرے نہیں۔ سہمے نہیں۔ رُکے نہیں ۔۔ انھوں نے اُس وقت یہ محسوس کیا کہ اس سچائی کو مان لینا اور فوراً مر جانا اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ کوئی اس سچائی سے محروم رہ کر عرصہ دراز تک ایک جانور سے بھی بدتر حالت میں بےکار جیتا رہے۔ ایک جانور سے بدتر حالت میں جینے اور جیتے رہنے کے بجائے وہ ایک انسان کی طرح مر جانا پسند کرتے تھے ۔۔ کیسے حیات انگیز موت شکن تھے وہ الفاظ جن کو سنتے ہی ثوبانؓ کے اندر زندگی سے بھی بڑی زندگی کا یہ طوفان موجزن ہو گیا تھا!

"خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں"

ہاں یہی تھے وہ الفاظ جنھوں نے ثوبانؓ میں اچانک یہ حوصلہ پیدا کیا کہ اب وہ نہ ایک جانور سے بھی ذلیل تر زندگی بسر کریں گے اور نہ ایک شیطان کی طرح دوزخ کی آگ میں دھکیلا جانا پسند کریں گے۔ ایمان ان کے اندر پھوٹ پڑا تھا اور اسی دم دنیا کے تمام خطرات کی طوفانی منجدھار ان کی نظر میں محض ایک سراب ہو کر رہ گئی تھی جس کے اُس پار جنت کے دروازوں سے ان کے خدا کی رحمت ایک حقیر بندے کی روح کو آواز پر آواز دے رہی تھی۔

اور ۔۔۔

اس آواز پر وہ چل کھڑے ہوئے ۔ غلامی کی زنجیریں ان کے قدموں کو کہاں روک سکیں. ظلم و سفّاکی کے کڑے تیور ان کا حوصلہ کہاں چھین سکے ۔۔ خطرات ٹھوس اینٹ پتھر بن کر ان کے اُوپر برس پڑے ۔ لیکن مظالم سے سنگسار ہوتے ہوئے بدن سے خون اور آنسوؤں کا جو بھی قطرہ ٹپکا اس نے زمین کے ذرّے ذرّے میں اس حقیقت کا سوز بکھیر دیا کہ "خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں"

آزمائش شروع ہوئی ۔۔ رفتہ رفتہ نقطۂ عروج تک پہنچی اور پھر ہر بیکس کے ملجا، ہر مظلوم کے حامی رسولِ خدا نے حضرت ثوبانؓ کو ان کے مشرک آقا سے خرید کر ظلم و قہرمانیت کے شکنجوں سے نجات دلا دی ۔ نجات دلا دی اور ارادہ فرمایا کہ ثوبانؓ کو خدا کی راہ میں خود بھی آزاد فرما دیں "آزادی" جیسی نعمت کے لئے ترستے ہوئے ثوبانؓ کے لئے یہ خبر آزادی ہی کی خبر تھی ۔۔ لیکن ...... وہ اس خبر کو سن کر رو دیئے!۔۔ انھوں نے آنسوؤں کی جھڑی سے اس "خوش خبری" کا استقبال کیا ۔۔ کیسا تھا وہ خدا کا آخری رسولؐ جس کی غلامی کو لوگ اپنی آزادی سے بھی زیادہ قیمتی سمجھتے تھے!!

"میں نے تمھیں آزاد کیا" اشرف المخلوقات کو تمام جھوٹے خداؤں کی بندگی کی لعنت سے نجات دلانے والے

پیغمبرؐ نے کہا "اب تم قطعاً آزاد ہو — اب تم چاہو تو اپنے وطن عزیز یمن میں واپس جاکر اپنے عزیزوں کے درمیان مزے سے رہ سکتے ہو اور — اگر چاہو تو میرا گھر بھی تمھارا اپنا گھر ہے — لیکن یہاں اب تم میرے "غلام" نہیں بلکہ میرے اہل خانہ میں شمار ہوں گے۔"

ثوبانؓ نے اپنی آزادی کی خبر سُنی — مدتوں سے بچھڑے ہوئے وطن عزیز یمن کا نام بھی سُنا جہاں خون اور جذبات کے رشتوں کی ایک پوری فوج ان کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ان میں ان کے ماں باپ، بہن بھائی اور دوست احباب سبھی تھے۔ عزیزوں کے گھر تھے۔ دوستوں کی دلچسپ مجلسیں تھیں۔ بازار اور منڈیاں تھیں۔ سڑکیں اور گلیاں تھیں۔ ماضی کی سیکڑوں یادیں اور مستقبل کے ہزاروں خواب تھے۔ لیکن خوابوں اور حقیقتوں کی اس پوری بستی میں محمد عربیؐ نہیں تھے۔ اس لئے ثوبانؓ کو ایسا لگا جیسے وہاں کچھ بھی نہیں تھا — — محمد عربیؐ! — جن کی خاک پا ثوبانؓ کو اپنے وطن کی خاکِ عزیز سے بھی زیادہ پیاری تھی — وہ ان کو چھوڑ کر کیسے چلے جاتے! — وہ اخوتِ ایمانی کے عزیز چہروں کو چھوڑ کر محض خون کے رشتوں کی طرف کیسے چلے جاتے! — حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ جہاں محمدؐ اور ان کے ساتھی ہیں وہاں زندگی کوئی پھولوں کی سیج نہیں — وہاں تو زندگی کا ہر قدم جہاد زندگی کی پُر خار وادی ہے — وہاں تو زندگی کا ہر سانس آزمائش و ابتلا کی خار آشنا گھاٹی ہے — لیکن مصائب کی یہ خطرپوش وادی، آزمائشوں کی یہ سنگلاخ گھاٹی ان کو اپنے وطن عزیز سے زیادہ عزیز تھی — وہ خوشی سے بے قرار ہو گئے کہ جس چیز کا کبھی وہ خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے وہ خواب یہاں ایک حقیقت میں ڈھل رہا تھا — وہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر قریب ہو رہے تھے جہاں ان کا شمار — ایک لُٹے پٹے غلام کا شمار رسول اللہؐ کے "گھر والوں" میں ہو رہا تھا — بشرطیکہ ان کا دل اس کی یہ قیمت دے سکے کہ اللہ والوں میں رہنا سہنا انھیں اپنے گھر والوں میں رہنے سہنے سے زیادہ پیارا ہو جائے۔

— یہ تاریخ ہے کہ ثوبانؓ نامی شخص نے محمد عربیؐ کی بارگاہ میں یہی قیمت جی جان سے پیش کی — اور اس طرح پیش کی جیسے اتنی بڑی قیمت ایک بہت ہی چھوٹی سی قیمت تھی — جیسے یہ کوئی قیمت ہی نہ تھی — جیسے مفت میں انھیں دولتِ دوجہاں مل گئی ہو۔ خدا کی قسم! — وہ نہیں گئے۔ کبھی نہیں گئے — کہیں نہیں گئے۔ وطن سے بچھڑا ہوا انسان محمدؐ سے بچھڑنے کو تیار نہ ہوا۔ وہ تو وطن جانے کی پیش کش پاکر آں حضرت کے دامنِ رسالت سے لپٹ کر رہ گیا۔ چمٹ کر رہ گیا۔ سفر میں حاضر۔ حضر میں موجود — خلوت میں ساتھ ساتھ — جلوت میں فرشِ راہ! — ایک پروانے کی سپردگی بھی ثوبانؓ کے عشق رسولؐ کے آگے ہیچ ہوکر رہ گئی۔ کوئی پروانہ بھی شمع کا طواف دن رات نہیں کرسکتا۔ مگر ثوبانؓ کی زندگی کے توشب و روز اس ہستیؐ کا طواف کر رہے تھے جو ایک مشت خاک تھا مگر خدا کی نظر میں "سراج منیر" قرار پایا تھا۔

اسی دور "جذب وجنوں" میں ایک بار ثوبانؓ حضورؐ کو والہانہ تک رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ آنحضرتؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور اپنے اہل بیت کے لئے اس ہستی سے سوال شروع کیا جس کے خزانوں میں کسی شے کی کمی نہیں۔ بظاہر یہ محض ایک دعا ہو رہی تھی۔ مگر ثوبانؓ نے محسوس کیا کہ یہ تو دولتِ دو جہاں لٹ رہی ہے۔ وہی ثوبانؓ جس نے دین کے لئے دولتِ دنیا کی گرد کا آخری ذرّہ تک اپنے دامن سے جھٹک دیا تھا دامن پھیلائے ہوئے جھولی اُٹھائے ہوئے والہانہ، بیتابانہ آگے بڑھے — وہ تو سچ مچ گڑگڑانے لگے۔

"حضور! ... حضور! — میں بھی ... میں بھی تو آپ کے اہل بیت میں ہوں ... حضور! میں بھی ..."

"ہاں!" بیکسوں کی ڈھارس بندھانے والے نے کہا۔ "ہاں — تم بھی میرے گھر کے آدمی ہو۔ مگر اسی وقت تک جب تک تم خدا کے آستاں کے سوا کسی دوسری چوکھٹ پر کھڑے نظر نہ آؤ — خدا کے سوا کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔"

ثوبانؓ نے سراپا گوش بن کر حضورؐ کا فرمان سنا — اور محسوس کیا کہ نبیؐ کے اہل بیت میں شمار ہونے کی یہ دوسری

قیمت ہے جو ان کو دل و جان سے پیش کرنی ہے۔ یہ قیمت اس پہلی قیمت سے بھی زیادہ بڑی تھی جو وہ پیش کر چکے تھے۔ یہ عمر بھر کا ایک عظیم جہاد تھا — یہ تو خدا کے لئے محض وطن ہی نہیں ساری دنیا سے اپنی امیدوں اور آرزوؤں کے رشتے کاٹ ڈالنا تھا یہ تو محض اللہ کے بھروسے پر جینا اور دنیا بھر کے لئے جیتے جی مر جانا تھا۔

لیکن حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ قیمت بھی بے دریغ پیش کر دی۔ اس واقعہ کے بعد انھوں نے ایک بالکل نئی زندگی شروع کی — اس نئی زندگی کے آغاز سے اپنی موت تک انھوں نے مخلوق سے کسی قسم کا کبھی کوئی سوال ہی نہیں کیا — اس زندگی کے پورے عرصہ میں وہ اس طرح زندہ رہے کہ اگر سواری کرتے ہوئے ان کا کوڑا بھی ہاتھ سے چھوٹ گرا تو پاس سے گذرنے والے سے یہ نہیں کہا کہ یہ کوڑا اٹھا دو — اس کے لئے وہ خود ہی مرکب کو روک کر نیچے اُترے — اپنے ہاتھ سے اپنا کوڑا اٹھایا اور دوبارہ سوار ہو کر آگے بڑھے — آہ! یہ زندگی! کہ جس کا ہر سفر خدا ہی کی طرف ایک جلیل سفر تھا۔ جس کا ہر قدم اس سفر بندگی کی رفتار تیز کرتا ہوا اٹھتا تو مسافر اور منزل دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگتے۔ ایک بندہ اپنے خدا کی طرف بڑھ رہا تھا اور خدائے ذوالجلال بہ نفس نفیس اس حقیر بندے کی سمت میں اس بندے سے بھی تیز تر نزدیک آ رہا تھا —

سُنا ہے ہم بھی اسی "سفر" میں ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ ثوبانؓ خود خدا کی طرف بڑھ رہے تھے اور ہمیں وقت گھسیٹے لئے جا رہا ہے۔ وہ اپنے پیروں چل کر منزل تک پہنچے اور ہمیں انتظار ہے کہ دوسرے ہمیں اپنے کاندھوں پر سوار کر کے لے جائیں۔ — وہ ایک سچے خالق کے سائل تھے — ہاں وہ ایک اکیلے غنی کے فقیر تھے — اور ہم نہ جانے کس کس در کے فقیر ہیں — بے غیرت ناشکرے اور ذلیل — پھر ڈھٹائی دیکھو ہمیں یہ اُمید بھی ہے کہ ہماری اس پیشانی کو ...... جھوٹے خداؤں کی آستاں بوسی سے داغدار پیشانی کو بھی انتہائی غیرت مند اللہ کی رحمت قیامت کے دن بوسہ دے گی۔ کاش ہم ہمیشہ کے لئے بہرے ہو جانے سے پہلے کسی کی یہ آواز بھی سُن سکتے:۔ بتوں سے تجھ کو امیدیں — خدا سے نومیدی ٭ مجھے بتا تو سہی اور "کافری" کیا ہے؟

تاریخ فقہ اُردو
دنیائے عرب کی معروف ہستی علامہ شیخ محمد خضری بک مصری کی معرکۃ الآراء کتاب کا سلیس اُردو ترجمہ۔ فقہ کی مرتب تاریخ اور بیش بہا معلومات کا خزینہ۔ مجلّد نو روپے۔

ازالۃ الخفاء
خلفائے راشدین کے صحیح مقام و منصب ان کے تقابلی مراتب اور ان کے کردار و سیرت پر محقق شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کی مشہور کتاب کا اُردو ترجمہ اس میں ان اعتراضات کے جوابات بھی ملتے ہیں جو گمراہ فرقوں نے پہلے تینوں خلفاء پر کئے ہیں اور آج تک ان کا ناپاک سلسلہ جاری ہے۔ دو جلدوں میں مکمل۔ مجلد چوبیس ۲۴ روپے

کتاب الصّلوٰۃ
نماز کے مسائل پر ویسے تو بہت کتابیں ہیں مگر مولانا عبدالشکورؒ کی یہ کتاب اپنی نظیر آپ ہے۔ ڈھائی روپے۔

بیانُ اللسان
بہترین عربی اُردو ڈکشنری۔ ہزاروں الفاظ۔ محاورے۔ ضرب الامثال۔
مجلّد دس روپے

قاموس القرآن
الفاظ قرآنی کی لاجواب لغت، قرآن کو خود اس کی زبان میں سمجھنے کے لئے یہ لغت بہت مفید و کامیاب سمجھی گئی ہے۔
قیمت مجلّد نو روپے

اسلامی حکومت کے نقش و نگار
اسلامی تاریخ کی سبق آموز جھلکیاں بلند کرداری اور عدل و امانت کے اعلیٰ نمونے۔
ایک روپیہ ۷۵ نئے پیسے

مناقبِ امام اعظمؒ
امام ابو حنیفہؒ کے اوصاف و کمالات پر ایک مختصر لیکن شافی کتاب جو ضخیم کتابوں کا نچوڑ ہے۔ ۷۵ نئے پیسے

مصائب الصحابہؓ
اللہ اکبر۔ اسلام لانے کی سزا میں صحابہؓ نے کیا کیا نہیں جھیلا — اس داستانِ خونچکاں کو نور الحسن بخاری کے زرف نگار قلم سے پڑھیئے۔ مستند اور سبق آموز۔ دو روپے۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

مستقل عنوان

تجلّی کی ڈاک

خودکشی کا مسئلہ

سوال ۱:— از عبدالغنی - ضلع اورنگ آباد -

فسادات کے مواقع پر اکثر مسلم خواتین غنڈوں کے دستِ ظلم سے محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ غنڈے ان کے شوہروں کو یا تو قتل کر دیتے ہیں یا فرار پر مجبور کر دیتے ہیں۔ گھر کا مال و اسباب لوٹ لے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی عصمت پر ڈاکہ ڈالنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس حالت تک پہنچنے کے بعد عورت ہر طرح کوشاں رہنے کے باوجود اپنی آبرو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے اور موت کو ترجیح دے کر اپنے آپ کو ہلاک کر لے تو کیا ایسی موت اصطلاحی معنی میں حرام موت کہلائے گی؟ ایسی صورت میں اس مصیبت میں گرفتار عورت کو کیا کرنا چاہیئے؟ براہِ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب ۱:—

دنیا میں غم و مصیبت کی بے شمار قسمیں اور نوعیتیں ہیں۔ اسلام کا جامع اور اصولی سبق یہ ہے کہ ہر شخص اپنی قوت و اختیار کی حد تک ہر پیش آمدہ غم و مصیبت کو دفع کرنے کی کوشش کرے اور نتیجہ جو کچھ بھی نکلے اس پر صابر و شاکر رہے۔ یہ اجازت اسے نہیں دی گئی ہے کہ غم و مصیبت کو دفع کرنے میں کامیابی نہ ہو تو خودکشی کر لے۔ زندگی خدا کی امانت ہے۔ اسے اپنے ہاتھوں ضائع کرنے کا مجاز آدمی کسی بھی حالت میں نہیں قرار دیا گیا۔

اس سبق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری نہیں کہ ایک مسلمان خاتون کے لئے واحد صحیح راستہ صبر و شکر ہی کا ہے اس کا شوہر قتل کر دیا گیا ہو یا جبراً اس کی عصمت لوٹ لی گئی ہو۔ یہ مصیبتیں اگرچہ بہت بڑی ہیں لیکن اسلام کی روشنی سے منور قلب و ذہن خوب جانتے ہیں کہ ظالموں کے ہاتھوں جتنا بڑا دکھ انھیں پہنچے گا اتنا ہی بڑا اور شاندار اجرِ آخرت انھیں اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا۔

عصمت بڑی قیمتی شے ہے اور ایک پاکدامن خاتون کے لئے کسی ظالم کی سیاہ کاری کا نشانہ بن جانے سے زیادہ تکلیف دہ بات شاید ہی کوئی ہو مگر اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کی نظر میں ایسی مظلومہ نہ تو بے آبرو ہوتی ہے نہ موردِ الزام بلکہ وہ ایسی ہی عفیفہ اور معصوم رہتی ہے جیسے ماں کے پیٹ سے نکلا ہوا مولود۔ اسے نفرت و کراہت کی نظر سے دیکھنا یا مطعون کرنا اسلام کی نظر میں ظلمِ عظیم ہے وہ تو بہت بڑے انعامِ آخرت کی مستحق ہو چکی بشرطیکہ صبر و شکر کی روش پر قائم رہے اور جو بھی مصیبت اس پر پڑ چکی ہے یا آگے کو پڑنی ہے اسے اس ذہن کے ساتھ برداشت کرتی جائے کہ اللہ اس کے ایمان کا امتحان لے رہا ہے۔

گناہ اللہ کے نزدیک صرف وہ فعلِ بد ہے جسے ہم نے ارادۃً کیا ہو۔ ایسا کوئی فعل گناہ نہیں ہے جس کے ارتکاب میں ہمارے ارادے کو دخل نہ ہو بلکہ ہم بے بس ہو کر رہ گئے ہوں۔ لہٰذا جو مسلمان عورتیں کسی شیطان کی جابرانہ ہوس کاری کا ہدف بنی ہوں وہ حقیقت میں بے آبرو نہیں ہوئیں۔ بلکہ صرف ایک جسمانی ایذا انھیں پہنچی ہے جس کے بدلے ان شاء اللہ بہت کچھ نعمتیں آخرت

ہیں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ مسلمان معاشرے پر فرض ہے کہ ایسی مظلوم ہستیوں کی دلداری کرے۔ انھیں احترام کی نظر سے دیکھے۔ ان کی سماجی حیثیت کو دوسری عفیفہ خواتین سے گرا ہوا نہ سمجھے، انھیں شمہ برابر یہ احساس نہ ہونے دے کہ ان کے دامن عزت پر کوئی داغ لگ گیا ہے۔ اگر ان کے شوہر قتل ہو گئے ہوں تو شریف سے شریف تر مسلمان کو ان سے نکاح میں ہرگز عار نہیں ہونا چاہئیے اور پاس پڑوس والوں کو اس محفل نکاح میں اس سے بھی بڑھ کر خوش دلی اور دلی میلان کے ساتھ شریک ہونا چاہئیے، جس کا مظاہرہ کسی شریف تر خاتون کے نکاح کی شرکت میں ہوتا ہے۔

دراصل اسلام اور غیر اسلام میں یہی تو فرق ہے کہ سخت آفات کے پیش آ جانے پر اسلام ہمارے ذہن کو یہ سرمایۂ تسکین عطا کرتا ہے کہ اللہ کی مشیت اور حکمت تکوینی سے تحت جو بھی ظلم شدید ہمارے نصیب میں آیا ہے وہ نہ تو کوئی ایسا نقصان ہے جس کا بدلہ ہمیں کبھی نہ ملے اور نہ وہ کوئی ایسا عذاب الیم ہے کہ حواس باختہ ہو کر ہم خدا کو ہی بھول جائیں ہم نے اگر صبر و شکر سے کام لیا اور اپنے مقدور بھر تدبیر اور مزاحمت کر لی تو اب ہمیں فکر و اندیشے کی ضرورت نہیں۔ زندگی کی قلیل سی مدت اگر مصیبت ہی میں کٹتی ہے تو اس کے صلے میں لامحدود مدت کے عیش و راحت ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے ہمکنار ہونے کے لئے ہمیں تھوڑا سا صبر و ضبط کرنا ہے۔ عجلت اور بے ہمتی کی رو میں ہم نے اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ لیا تو یہ اخروی صلہ جلد ملنے کے عوض بہت دور چلا جائے گا اور ہمارا رب کہے گا کہ تم نے آزمائش میں کھرا اترنے کی کوشش نہیں کی اور اس زندگی کو ذبح کرنے کے مرتکب ہوئے جو ہماری امانت تھی۔

یہی ذہنی و فکری سرمایۂ تسکین ہے جس نے امت مسلمہ میں خودکشی کو کبھی بھی عام نہیں ہونے دیا ہے جب کہ دوسری قوموں میں یہ جرم خاصا عام ہے۔ اسلام کے سوا کوئی مذہب نہیں جو دو ٹوک انداز میں لَا یُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کا اصول محکم بیان کرتا ہو اور اسلام کے سوا کوئی دین نہیں جو قطعیت کے انداز میں لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کا قانون سامنے لاتا ہو۔ جب ہر متنفس اپنی طاقت ہی کی حد تک مکلّف اور جوابدہ ہے تو اس مومنہ خاتون کو بے آبرو کیسے قرار دیا جا سکتا ہے جس کے ساتھ ایک بار نہیں بلکہ خدا نخواستہ دس بار بھی یہ واقعہ پیش آ جائے کہ اس کی مزاحمت پر ہوس کار مرد کی قوت قاہرہ غالب آ گئی ہو۔ اور ایسی مومنہ کو نفرت کا نشانہ کیسے بنایا جا سکتا ہے جب کہ ظلم کا مرتکب تو مرد ہے اور اس کے فعل و عمل کی کوئی ذمہ داری اس مظلومہ کے سر نہیں ہے۔

جواب کو قدرے طویل اس لئے کرنا پڑا کہ ہم جس ملک میں ہیں وہاں ظلم و بربریت کے مناظر محض ایک مفروضہ نہیں ہیں بلکہ بار بار ظہور میں آنے والے تلخ حقائق ہیں لہٰذا مظلومہ خواتین کو اسلام ہی سے رہنمائی لینی چاہئیے اور مردوں کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیے کہ جن پاکباز خواتین کو روزمرہ کی اصطلاح میں "بے آبرو" ہونا پڑا ہے وہ حقیقۃً اسی طرح باآبرو اور عفیفہ ہیں جس طرح ہماری وہ بیٹیاں اور بہنیں جنھیں کسی مرد کے ہاتھ نے نہیں چھوا۔ اور ایسی مظلوم خواتین کو حقارت و نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے عوض ہمارا فریضہ ہے کہ ان کے ساتھ بہترین سلوک، دل داری اور عزت کا برتاؤ کریں تاکہ صدمے اور حیا کی شدت انھیں خودکشی جیسے کافرانہ اقدام پر نہ اکسائے۔

ایسی ہر مظلوم بہن کو ہم قرآن کے چند الفاظ سناتے ہیں:۔

فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ	جن لوگوں نے ترک وطن کیا اور
اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ	اپنے گھروں سے نکالے گئے اور
وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا	میری راہ میں تکلیفیں دیئے گئے
وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ	اور انھوں نے جہاد کیا اور قتل کئے گئے، ضرور میں ان لوگوں
سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ	کے تمام گناہ معاف کر دوں گا
جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا	

الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ (آل عمران)	اور ضرور انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ صلہ ملے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ ہی کے پاس ہے عمدہ صلہ۔

❊ ❊ ❊ ❊

یہ آیتیں نہ کسی زمانے سے خاص ہیں نہ مردوں تک محدود ہیں۔ ان میں ایک ایسا روشن درسِ حیات مذکور ہے جو قیامت تک کے لئے سدا بہار ہے۔ درس یہ ہے کہ جن لوگوں کو کافرین و مشرکین اس لئے ستائیں کہ وہ مسلمان ہیں ان کا کردار یہ ہونا چاہئیے کہ اگر ظالموں کے مقابلے میں وہ بہت کمزور ہیں تو اس مملکت سے رخصت ہو جائیں جہاں ظالموں کا اقتدار ہے ایمان ہر شے سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسی کو ہجرت کہتے ہیں اور اگر ہجرت کا راستہ نہیں ہے تو ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ پروا نہیں کہ اس مقابلہ میں وہ اور ان کے اہل و عیال قتل کر دیئے جائیں۔ اس کردار کی جزا اللہ تعالیٰ یہ دے گا کہ ان کے گناہ معاف کر کے بہشت میں داخل فرما دے گا۔

عورت اور مرد سب اس سبق میں شریک ہیں۔ عورت کو جتنی طاقت اللہ نے دی ہے اسی کی حد تک اس پر مقابلہ اور مقاتلہ بھی فرض ہے۔ اس فرض کو ادا کرنے کے بعد عورت کے لئے بھی خدا کا یہی فیصلہ ہے کہ اگر وہ قتل کر دی گئی تو اس کے گناہ بخش کر بہشت میں بھیج دیا جائے گا اور اگر قتل نہ کی گئی بلکہ بے عصمت کر دی گئی یا کنیز بنا لی گئی تب بھی اسے آخرت میں اس کی ہر جسمانی اور ذہنی تکلیف کا بہت بڑا اجر دیا جائے گا۔ وہی فعلِ زنا جسے اگر وہ آمادگی کے ساتھ کرتی تو جہنم کا کندہ بنتی موجودہ مظلومی و مجبوری کے عالم میں اسکے درجات و حقوق بڑھانے کا موجب بنے گا۔ وہ گھبرائے نہیں۔ اسے جو کچھ دنیوی خسارہ پہنچا ہے اس سے کہیں بڑا اور بھیانک خسارہ خود ظالم کو پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ - (بروج)	جن لوگوں نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو ظلم و جور کا نشانہ بنایا پھر توبہ نہیں کی ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے، اور (بالخصوص) آگ کا عذاب۔

ان آیات کو پڑھتے ہوئے یہ مت تصور کیجئے کہ مومنین و مومنات سے صرف وہی مومن مرد و زن مراد ہیں جنھیں دورِ رسالت میں کافروں اور مشرکوں کی بربریت کا نشانہ بننا پڑا بلکہ اللہ کے فضل و کرم سے ہم اور آپ بھی اسی فہرست میں شامل ہیں چاہے ہمارا نام کتنے ہی نیچے ہو۔ ان آیتوں میں ظالموں کے لئے جس آتشیں عذاب کی وعید سنائی گئی ہے غور تو کیجئے کیا وہ اُس مصیبت سے ہزار گنا بڑی مصیبت نہیں جس میں انھوں نے بالجبر آپ کو مبتلا کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارا درجہ اُن بہادر اسلاف جیسا نہیں جو سر ہتھیلی پر رکھ کر اعلائے کلمۃ الحق کرتے تھے۔ جن کی تجارت اور ملازمت اور مزدوری سب کا محوری مقصد تھا خدا کے دین کی سربلندی اور اس کی پاداش میں وہ زخم کھاتے تھے، گھروں سے نکالے جاتے تھے اور ہر طرح کی سختیاں پورے صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے اپنے رب سے جا ملتے تھے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ لیکن ہمیں بھی ان کی غلامی کا فخر تو حاصل ہے ہی۔ ہمیں بھی ان سے ایک روحانی نسبت تو میسر ضرور ہے۔ ہمیں بھی ہمارے ہی وطن میں بارہا اسی لئے تو ستایا اور برباد کیا جاتا ہے کہ ہم رسولِ عربی ﷺ کی غلامی کا دم کیوں بھرتے ہیں۔ تب ہم اگر غنڈوں اور لٹیروں سے اپنی عزت اور جان و مال بچانے کی جائز جدوجہد میں قتل ہو جائیں گے یا ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو جبری ہوسناکیوں کا شکار ہونا پڑے گا تو کیوں نہ ہمارا رحیم و کریم اور بے حد سخی رب ہمیں ہماری مظلومیت اور نقصان کا بھرپور معاوضہ دے گا۔ بس شرط یہ ہے کہ ہم مصیبت کے وقت بزدلی نہ دکھائیں، خودکشی کے فعلِ حرام کا تصور دل میں نہ لائیں ڈٹ کر مزاحمت کریں اور جو کچھ بھی نتائج نکلیں انھیں صابر و شاکر اہلِ ایمان کی طرح انگیز کر لیں۔

حلالہ کا مسئلہ

سوال ۲۷:— (ایضاً)

مطلقہ عورت کو پہلے شوہر کے لئے حلالہ کرانے کا طریقہ مسائل میں یوں بیان ہوا ہے کہ مطلقہ کو پہلے کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنا چاہیئے، نکاح کے بعد خلوتِ صحیحہ ضروری ہے پھر وہ شخص بخوشی اس کو طلاق دے اس وقت پہلے شوہر کے عقد نکاح میں آئے گی۔ مسئلے کی روشنی میں درج ذیل صحیح واقعہ کی صحت و عدم صحت پر ضرور روشنی ڈالیں اور آخر میں وضاحت فرمائیں۔

"زید نے مقامی نائب قاضی اور دیگر قریبی دینی معلومات والے بزرگوں کے مشورے پر اپنی مطلقہ سے دوبارہ نکاح اس طرح کیا۔ مذکورہ بزرگوں نے مشورہ دیا کہ اپنے سگے بھائی سے نکاح کرا دو صبح طلاق دلوا کر تم نکاح کر لو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا شام میں نکاح ہوا، باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ خلوت صحیحہ نہیں ہوئی تھی۔ آٹھ بجے دن میں مذکورہ قاضی کے ذریعہ طلاق نامہ اور زید کا اسی مجلس میں نکاح ہو گیا اس سلسلے میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ قاضی کا یہ عمل از روئے شرع کیسا ہے اور حلالہ کے لئے سگے بھائی کا عمداً انتخاب کرنا کہاں تک درست ہے تفصیل سے جواب دیں۔

جواب:-

مسلمانوں کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ شریعت نے تو ان کے لئے تمام اور معاملات کی طرح نکاح و طلاق کے معاملات میں بھی آسانیاں دی تھیں مگر انھوں نے اپنی حماقتوں سے نوع بہ نوع دشواریاں پیدا کر لیں۔

اب طلاق ہی کا مسئلہ لیجئے۔ شریعت نے تنبیہ کی تھی کہ تین طلاقیں مت دینا ورنہ حلالہ کے بغیر اس عورت سے دوبارہ نکاح ممکن نہ رہے گا۔ اب اس تنبیہ کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جنھیں کسی معقول وجہ سے طلاق دینی ہی تھی وہ بس ایک طلاق دے کر قصّہ ختم کر دیتے۔ اس کے بعد انھیں پوری گنجائش رہتی تھی کہ اگر غصّہ اتر جانے کے بعد اس فعل کی غلطی محسوس کر لیں تو بلا کسی مصیبت کے رجوع کر لیں اور رشتۂ نکاح پھر سے جڑ جائے اور رجوع کی ضرورت نہ سمجھیں تو وہی نتیجہ اس ایک طلاق سے حاصل ہو گیا ہے جو تین یا سو طلاقوں سے حاصل ہو سکتا تھا۔

مگر شریعت کی روشن ہدایت کو بھلا دیا گیا اور اب جسے دیکھو جوشِ مردانگی میں طلاقوں کی رٹ لگانا شروع کر دیتا ہے۔ پھر جوشِ حماقت سرد ہونے کے بعد دوڑ دھوپ ہوتی ہے کہ یہ میں نے کیا کیا مفتیوں کے پاس حاضر ہوا جاتا ہے اور مفتی نے حلالے کی شکل بتا دی تو کسی دوسرے مفتی کی تلاش کی جاتی ہے کہ شاید وہ کوئی آسان راستہ نکال دے۔ بارہا تو عطائی مولویوں سے فتویٰ لے کر کام چلا لیا جاتا ہے اور بارہا صورتِ واقعہ کو مسخ کر کے نکاح ثانی کا فتویٰ حاصل کر لیا جاتا ہے۔ یہ سب بدنصیبی کی باتیں ہیں۔

حلالہ کی جو صورت سوال میں دی گئی وہ ہرگز کافی نہیں ہے۔ قطعاً ضروری ہے کہ مطلقہ سے جس دوسرے مرد نے نکاح کیا ہے وہ کم سے کم ایک بار صحبت بھی کرے۔ فقط اصطلاحی "خلوتِ صحیحہ" بعض اور مسائل میں تو چل جاتی ہے مگر حلالہ کے مسئلہ میں یہ نہیں چلے گی بلکہ مباشرت لازماً ہونی چاہیئے۔

اور سوال میں تو "خلوتِ صحیحہ" سے بھی انکار ہے۔ — انکار ہی نہیں بلکہ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حلالہ کرانے والوں نے پہلے سے سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق خلوتِ صحیحہ نہیں ہونے دی ہے ورنہ وہ اتنے جاہل تو نہیں ہو سکتے تھے کہ بھائی صاحب کی دی ہوئی طلاق کی عدت گزروائے بغیر شوہر اول سے نکاح پڑھا دیتے۔ معلوم ہے کہ خلوتِ صحیحہ کے بعد جو طلاق دی جائے گی اس کی عدت پوری کئے بغیر عورت کہیں اور نکاح نہیں کر سکتی۔ لہٰذا یہ حلالہ محض ایک ڈرامہ ہوا جس سے جہلا تو دھوکا کھا سکتے ہیں مگر اللہ کے نزدیک یہ محض ایک فریب ہوگا جو اللہ کی شریعت سے کیا گیا۔ حلالہ کی غرض سے نکاح کرنا کرانا — یعنی بس ایک شب کے لئے طے کر کے کسی مطلقہ کا نکاح کرا دینا یوں بھی فعل مردود ہے۔ اللہ اور اس کے رسول حلالہ کرنے اور کرانے والے پر لعنت بھیجتے ہیں — تاہم اس

مردود طریقے سے عورت پہلے شوہر کے لئے حلال تو ہو جاتی ہے ـــ مگر ضروری ہے کہ شوہرِ ثانی صحبت کر کے طلاق دے پھر عدّت گزاری جائے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ذکر فرمودہ نائب قاضی صاحب اور دیگر اہلِ علم نے کہاں سے یہ مسئلہ نکالا کہ نکاح و طلاق کا فقط ایک ڈھکوسلا کر وہ بلا صحبت و بلا عدت شوہرِ اول کے لئے عورت کو حلال کر دیگے خدا محفوظ رکھے ایسے معاملات میں بڑی احتیاط برتنی چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک مومن جوڑا تا زندگی حرام کاری میں مبتلا رہے۔

ہندوؤں کا جھوٹا

سوالؔ: ـــ (نام اور پتہ لکھنے کو منع کرتے ہیں)

ہمارا اُٹھنا بیٹھنا ہندو حضرات میں ہے۔ ہمارا کاروبار بھی اس نوع کا ہے کہ اکثر ہندو بھائیوں سے معاملہ رہتا ہے ہمیں سگریٹ اور حقّے کی عادت ہے۔ ہمارے ملنے جلنے والوں میں بعض ہندو بھی ان چیزوں کے عادی ہیں۔ اب دریافت کرنا یہ ہے کہ اگر کوئی ہندو اپنا حقہ ہمیں پینے کے لئے پیش کرے یا سگریٹ دے تو ہم اسے پی سکتے ہیں یا نہیں؟

علاوہ اس کے یہ بھی بتایا جائے کہ ہم کسی ہندو دوست کے ساتھ ایک ہی میز پر کھانا پینا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب بجائے خط کے رسالے سے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس طرح کے معاملہ سے واسطہ آج کل عام طور پر پیش آسکتا ہے۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ بعض مولوی قسم کے مسلمانوں نے ہمیں بتایا کہ غیر مسلموں سے ایسا خلا ملا درست نہیں ہے اور ان کے ساتھ ایک ہی میز پر کھانے پینے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ ایک دن ہمارے ایک بے تکلف ہندو دوست نے اپنے ہاتھ سے لڈو ہمارے منھ میں ٹھونس دیا اور ہم نے باوجود دلی کراہت کے لحاظ میں آ کے کھا لیا اس پر ایک مؤذن صاحب نے دوسرے وقت ہمیں یہ بتایا کہ آپ نے سخت گناہ کیا غیر مسلم کے ہاتھ سے لڈو کھانا حرام کھانے کے برابر ہے؟

جوابؔ: ـــ

افسوس مسلمان عوام تو کثرت سے جاہل ہیں ہی۔ بہت سے وہ مسلمان بھی جاہلوں سے کم نہیں ہیں جنھوں نے کسی مدرسے میں پڑھ تو لیا ہے مگر اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور اصول و کلیات سے بے بہرہ ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے کردار و گفتار سے اسلام خاصا بدنام ہوا ہے اور غیر مسلموں کے اندر اس کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوئی ہیں۔

اب اسی مسئلے کو لیجئے۔ یہ مولوی اور مؤذن قسم کے لوگ جن کا آپ نے تذکرہ فرمایا بدترین قسم کے جاہل ہیں جنھوں نے دین کی صحیح تعلیم حاصل کرنے کے عوض اپنی تنگدلی، بے مغزی اور کج فکری ہی کو دینی مسائل میں مفتی بنا لیا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ کسی ہندو دوست کے ہاتھ سے لڈو کھا لینے میں تو حرج کیا ہوتا اگر یہ ہندو پورا لڈو اپنے منھ میں رکھ لے اور پھر اسے منھ سے نکال کر آپ کو دے کہ لو اسے کھا لو تب بھی کھا لینے میں کوئی گناہ ہے نہ آفت۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ انسان کا جھوٹا پاک ہے۔ مومن ہو یا کافر ہندو ہو یا عیسائی سبھی انسان ہیں اور اسلام کا بے لاگ عدل ان کے جھوٹے کو بھی اسی طرح پاک قرار دیتا ہے جس طرح مسلمان کے جھوٹے کو۔ ان کی دی ہوئی سگریٹ پینا، یا ان کے ساتھ ایک میز پر کھانا پینا تو ہلکی باتیں ہیں۔ اسلام تو اسے بھی حرام قرار نہیں دیتا کہ کوئی ہندو سگریٹ جلائے اس کے چند کش لے اور اسی کو آپ بھی پی لیں۔ حتیٰ کہ اگر اس کے سرے پر اس کا لعابِ دہن بھی نمی کی شکل میں صاف نظر آرہا ہو تو اسے پی لینے میں شرعاً کوئی حرمت نہیں ہے۔ یہ لعاب اسی طرح پاک ہے جس طرح ہمارا اور آپ کا لعاب۔ یا گھوڑے اور گائے کا لعاب۔ ایک ہی برتن میں سالن ہو اور ایک ہی روٹی کو توڑ کر آپ اور کوئی ہندو اسی سالن سے ساتھ ساتھ کھاتے جائیں تو اس میں بھی شرعاً کوئی گناہ نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ اسلام کفر و شرک کو نجاست سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن یہ نجاست حکمی ہے۔ اعتباری ہے۔ معنوی ہے

—— مادی اور ٹھوس نہیں۔ ایک مرد جس پر غسل فرض ہو یا ایک عورت جسے حیض آرہا ہو حکماً ناپاک ہی ہیں لیکن انکا جھوٹا شریعت نے اسی طرح پاک قرار دیا ہے جس طرح دوسرے انسانوں کا اور ان کے ساتھ کھانے پینے میں کوئی قباحت نہیں۔ اسی طرح کافر و مشرک کے ساتھ کھانے پینے میں کوئی قباحت نہیں ــ

ہم کسی ایسے ہندو کو نہیں جانتے جو اپنے حقے میں کسی مسلمان کو شریک کر سکے۔ ہندوؤں میں چھوت چھات بہت زیادہ ہے۔ بہت بے تکلف ہندو دوست بھی شاید ہی گوارا کر سکے کہ مسلمان دوست کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں لقمہ لگا سکے۔ لیکن ایسا اگر ممکن ہو تو خود مسلمان کے لئے اسمیں کوئی شرعی رُکاوٹ نہیں۔ حد ہے کہ اگر کسی ہندو نے ایک پلیٹ سے کھانا تناول کیا ہے اور ابھی اس پلیٹ میں بچا کھچا سالن لگا ہوا ہے تو کسی مسلمان کے لئے اس میں کوئی حرمت نہیں کہ دھوئے بغیر اسی پلیٹ میں مزید سالن نکال کر کھانا کھالے یا جس کچوری کو ہندو نے توڑ کر کھایا ہو اس کا باقی ماندہ ٹکڑا مسلمان کھالے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

اسلام بے حد روادار، حقیقت پسند اور انصاف پرور ہے۔ وہ چھوت چھات نہیں جانتا۔ وہ کفر و شرک سے حد درجہ بیزار ہونے کے باوجود انسانی شرف کو پامال نہیں کرتا۔ وہ توہم پرست نہیں۔ چھوئی موئی نہیں۔

رہی یہ بات کہ سگریٹ یا حقے کی نے پر لگا ہوا دوسروں کا لعابِ دہن طبّی نقطۂ نظر سے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے یا طبیعت کی نفاست نہیں گوارا کرتی کہ جو لڈو ایک اور شخص نے اپنے منہ میں رکھ لیا تھا اسے ہم اپنے حلق میں اتارلیں۔ یا دوسروں کے کھائے ہوئے برتن میں بغیر دھوئے مزید سالن اُتارنا نظافتِ طبع کے خلاف ہے تو یہ بات بالکل الگ ہے۔ اسلام حکم تو نہیں دیتا کہ آپ جھوٹا حقہ سگریٹ ضرور پئیں۔ یا جھوٹے برتن میں بغیر دھوئے سالن لازماً اُتاریں۔ آپکو اختیار ہے کہ اپنی طبیعت کے مطابق خوب صفائی کا اہتمام کریں۔ سالم سگریٹ پئیں۔ حقہ میں کسی کی شرکت گوارا نہ فرمائیں۔ اسلام نے تو فقط جواز دیا ہے وجوب نہیں۔ علاوہ اس کے یہ معاملہ سب کے ساتھ یکساں ہوگا۔ ہندو مسلمان کی قید نہیں۔ گفتگو تو اس میں ہے کہ کیا غیر مسلم کا لعابِ دہن ناپاک ہے، اور اسلام کا قطعی جواب یہ ہے کہ ہرگز ناپاک نہیں۔ یہاں تک کہ اگر یہ غیر مسلم عادی شراب نوش ہے لیکن جس وقت آپ اس کے برتن میں شریک ہو کر کھانا کھا رہے ہیں اس وقت اس کا منہ شراب کی بدبو سے نہیں بھبک رہا ہے اور سالن روٹی میں بھی کسی حرام جزو کے نہ پائے جانے پر آپ مطمئن ہیں تو شرعی اعتبار سے آپ پر کوئی گناہ لازم نہیں آتا کہ شوق سے شریکِ طعام ہوں ــ

جہاں تک شراب نوشی یا حرام اجزائے طعام کا تعلق ہے ہندو مسلمان سب کا یکساں حکم ہے۔ ہندو سالن یا مٹھائی میں گوبر ملادے یا مسلمان یہ حرکت کرے دونوں یکساں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں تمام انسانوں کا جھوٹا پاک ہے اور اس معاملہ میں ہندو مسلمان میں فرق کرنا اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

مشرک بدعتی کی امامت

سوال :- از محمد عبدالخالق ۔ کریم نگر۔

کریم نگر میں ایک مسجد کے پیش امام صاحب بیمار ہونیکی وجہ سے اُسی مسجد کا مؤذن نماز پڑھاتا ہے اُس کی اخلاقی حالت تو ایسی ہے کہ ناقابلِ بیان ہے۔ دوسری طرف علمی قابلیت تو بس جو کچھ ہے ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ عقیدے کے معاملے میں تو گمراہی کے عروج پر ہے۔ خصوصاً اچھے عقیدے والے لوگوں مثلاً جماعت اسلامی کے کچھ لوگ اگر نظر آجائیں تو فوراً آوازیں لگانا شروع کر دیتا ہے "المدد یا غوث اعظم دستگیر، یا غوث یا غوث یا غوث"

یہ آوازیں اس قدر بلند ہوتی ہیں کہ نماز پڑھنے والوں کی نماز میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ ہر وقت مسجد میں یہ آوازیں کرتا رہتا ہے۔ فحش کلامی بھی کرتا ہے اور بہت سی ایسی اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہے جس کا بذات خود ہمیں علم ہے۔ یہ مسجد دفاتر سے قریب ہے، اکثر اس میں دفاتر کے لوگ نماز کے لئے آتے ہیں۔

دوسری طرف نماز کو جانے میں کچھ دقت بھی ہے تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیئے؟

(۱) کیا ایسے شخص کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے جب کہ مجبوری ہو کہ دوسری طرف نہیں جا سکتے ہوں؟

(۲) علیحدہ نماز پڑھنا کیسا ہے اور جماعت کے ثواب کا کیا ہو گا؟

(۳) اگر نماز پڑھ بھی لی جائے تو کیا دوسری مرتبہ پڑھنا مناسب رہے گا، یا سرے سے اُس جماعت میں شریک ہی نہیں ہونا چاہیئے؟

اس مسئلے میں مختلف لوگوں کی مختلف رائے ہے وہ یہ کہ ایسے حالات میں انتشار مناسب نہیں ہے اس لئے نماز باجماعت پڑھ لینی چاہیئے لیکن ہمارا دل اس پر مطمئن نہیں ہے اس لئے آپ کو تکلیف دی جا رہی ہے، ہمیں آپ کے جواب کا شدید انتظار کرتا رہوں گا اس لئے کہ روزانہ کی پانچ نمازوں کا معاملہ ہے

جواب:-

جہاں تک فقہی جواب کا تعلق ہے مختصر سی بات یہ ہے کہ جاہل، بدکردار اور بداخلاق آدمی کی امامت مکروہ تحریمی ہے اور جو بدعتی شرکِ اعتقادی میں مبتلا ہوں ان کی امامت قطعی حرام ہے۔ ان کے پیچھے نماز برائے نام بھی نہیں ہوتی۔

جس قسم کے نعرے آپ نے مؤذن موصوف سے منسوب فرمائے وہ شرکِ اعتقادی کے مظہر ہیں۔ جو شخص جاہل اور فاسق ہونے کے ساتھ ساتھ مشرکانہ عقائد بھی رکھتا ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا انتہائی بے غیرتی ہے۔ نماز ادا ہونا تو درکنار پڑھنے والوں کو ڈرنا چاہیئے کہ آخرت میں ان سے نماز کی توہین اور دین کے معاملہ میں سخت بے حمیتی کا سوال نہ کر لیا جائے۔

یہ فقہی جواب ہوا ـــ لیکن پھر علاج کیا کیا جائے؟

اس کا حل مفتی کے پاس نہیں ہے بلکہ یہ آپ کے اپنے سوچنے کا مسئلہ ہے۔ آپ اگر ایک سچے مسلمان کی حیثیت میں نماز باجماعت کی قدر اور واقعی اہمیت کا احساس کرتے ہیں تو پھر اس مسجد میں نماز پڑھنے والوں کو دردمندی اور اخلاص و محبت کے ساتھ اس مکروہ ترین صورتِ حال کی طرف توجہ دلائیے۔ جو لوگ انتشار کے ڈر سے صبر و سکوت کو بہتر قرار دے رہے ہیں ان سے عرض کیجئے کہ اگر کوئی معمولی نوع کا نقصان واقع ہو رہا ہوتا تو بے شک صبر و سکوت کی گنجائش تھی۔ لیکن جب مسجد میں حاضری کا مقصد ہی فوت ہو رہا ہے اور ثواب کے عوض اُلٹا عذاب حصے میں آ رہا ہے تو فقط انتشار کے خوف سے خاموشی اختیار کئے رکھنا کہاں کی عقل مندی ہو گا۔ ہمیں اُمید ہے کہ اگر آپ نرمی، حکمت اور خوش اخلاقی کے ساتھ یہ بات مقتدیوں کے دماغ میں اُتارتے رہیں گے تو ان میں سے اکثر آپ کے ہمنوا ہو جائیں گے اور مل جُل کر اس صورتِ حال کی اصلاح کی جا سکے گی

اصلاح کی دو شکلیں ہیں۔ یا تو خود پیش امام صاحب ـــ جو بقول آپ کے بیمار ہیں ـــ اپنی صحت یابی تک کے لئے کسی ایسے شخص کو امامت کا مجاز بنا دیں جو پابندی سے مسجد میں آتا ہو اور نماز پڑھانا جانتا ہو۔ یا پھر وہ نمازیوں کو اجازت دیدیں کہ وہ آپس ہی میں کسی کو منتخب کر لیں۔ نمازیوں میں اگر کوئی ایسا شخص ہو جو پابندی سے آتا ہو اور نماز پڑھانے کا اہل ہو تو اس پر اتفاقِ رائے ہو سکتا ہے یا پھر ہر نماز کے وقت کسی کو چن لیا جائے۔

مؤذن موصوف اگرچہ اس نوع کی کسی بھی اصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوں گے اور بعید نہیں کہ جھگڑے بازی تک نوبت پہنچائیں لیکن اگر پیش امام صاحب اور نمازیوں کی بیشتر تعداد متفق الرائے ہو جائے تو مؤذن کی شر انگیزی اصلاح میں آڑے نہ آ سکے گی۔

جب تک اصلاح نہ ہو ہمارے نزدیک ایسے اوصاف والے مؤذن کے پیچھے نماز پڑھنا نہ پڑھنے سے بھی بدتر ہے اس سے تو بہتر ہے کہ نمازیوں میں سے جو بھی ایک دو آپ کے ہم رائے ہو جائیں ان کے ساتھ کسی اور جگہ جماعت کر لیا کریں۔ جماعت کے لئے مسجد ہی ضروری نہیں اللہ کی تمام زمین ادائے نماز کے معاملہ میں مسجد ہی کے حکم میں ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ کی علیحدہ جماعت کسی باقاعدہ قاری یا حافظ پر منحصر ہو۔ ذرا سی توجہ دیں تو آپ میں کا ہر شخص نماز پڑھا دینے کا اہل ہو سکتا ہے۔

خرابی میں اضافہ دراصل اسی لئے ہوتا چلا گیا کہ مسلمانوں نے دینی معاملات میں لاپرواہی تساہل اور جمود کی روش برتی۔ برائی کو اگر اس کے آغاز ہی میں ختم نہ کر دیا جائے تو وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کھلی بدعات و شرکیات سے فیصلہ کن لڑائی لڑنے کے عوض لوگوں نے ڈھیل دینے اور نظر انداز کرنے کا رویہ اختیار کیا اسی کا نتیجہ یہ سامنے ہے کہ ایک مسلمان علانیہ طور پر مشرکانہ نعرے لگاتا اور امامت کے مصلّے پر جما رہتا ہے ورنہ ایسے بدنہاد کے لئے تو امامت کا مصلّٰی کجا مسلم معاشرے میں منھ دکھانے تک کی گنجائش نہیں رہنی چاہیئے تھی۔ بالجبر ہم کسی کا عقیدہ نہیں بدل سکتے لیکن یہ تو کر سکتے ہیں کہ جو مسلمان سمجھانے بجھانے کے باوجود شرک و بدعت پر جمے رہنا چاہتے ہوں ان سے تمام سماجی تعلقات منقطع کر لیں۔ اسی کا اقرار اور اعتراف روزانہ وتروں میں کیا جاتا ہے ونشکرک ولا نکفرک ونخلع ونترک من یفجرک (اے اللہ ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں اور ناشکری نہیں کرتے اور ہر اس شخص سے رشتہ توڑ لیتے ہیں جو آپ کی صریح نافرمانی کرتا ہے)

ساداتؔ کو زکوٰۃ دینا

سوالؔ:۔ از غلام محمود۔ ورنگل (دکن)

سیّد کو زکوٰۃ و صدقات کی ادائگی شرعاً ناجائز ہے۔ لیکن اب جب کہ یہ گروہ مفلوک الحال ہے اور ان کے گذران کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔ کیا ان حالات میں شرعاً گنجائش نکل سکتی ہے؟

جوابؔ:۔

یہ کہنا درست نہیں کہ گروہِ سادات مفلوک الحال ہو چکا ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ دوسرے خاندانوں کی طرح سادات کے بھی بعض خاندانوں میں افلاس پہنچ چکا ہے اور بہتیرے افراد محتاج و غریب ہو چکے ہیں۔ انھیں زکوٰۃ دی جائے یا نہیں ـــــ اس سوال کا محتاط اور صحیح تر جواب تو یہی ہے کہ انھیں زکوٰۃ نہ دینی چاہیئے۔ علمائے احناف اسی پر اتفاق کرتے ہیں اور قوی دلائل کا تقاضا یہی ہے کہ اسی رائے کو واحد رائے تسلیم کیا جائے تاہم یہ دعوے نہیں کیا جا سکتا کہ اس رائے کے خلاف رائے موجود ہی نہیں ہے۔ فقہاء ایک ایسی روایت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سادات کو زکوٰۃ دینے کی ممانعت خاص زمانے تک تھی۔ یہ زمانہ گذر گیا تو اب ممانعت بھی باقی نہیں رہی۔

ہماری اپنی رائے علمائے احناف کے مفتیٰ بہ قول کے تابع ہے کہ سادات کو زکوٰۃ دینے کی ممانعت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ ہم اس سلسلے میں پہلے بھی یہ مشورہ پیش کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اللہ نے صاحبِ مال بنایا ہے اور ان کی نظروں میں بعض ایسے سادات بھی ہیں جنھیں مالی مدد کی احتیاج ہے تو کیوں نہ یہ لوگ انھیں بجائے مالِ زکوٰۃ کے تھوڑا سا قرضِ حسنہ دینے کی زحمت گوارا کریں، اور مالِ زکوٰۃ دوسرے مستحقین کو دیا کریں ممانعت مالِ زکوٰۃ کی ہے یہ تو نہیں کہ غریب سادات کو حسنِ سلوک کے طور پر بھی کچھ دینا ممنوع ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ زکوٰۃ تو ایک فریضہ ہے اسکی ادائگی صرف یہ ثابت کرتی ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر ہمیں اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلامیت کی خانہ پُری سے آگے ہمارے اندر انفاق فی سبیل اللہ اور اللہ کے غریب بندوں کی اعانت کا بھی کوئی جذبہ ہے تو ہمیں صرف زکوٰۃ کے حساب کتاب میں محدود ہو کر نہ رہ جانا چاہیئے بلکہ اس کے علاوہ بھی کچھ مال حسبِ استطاعت غرباء کو دینا چاہیئے۔ یہی چیز ہمیں خدا کے قریب کرتی ہے اور یہی چیز تزکیۂ نفس کی اساس ہے۔ زکوٰۃ، نماز اور دیگر فرائض دینیہ کی ادائگی سے بس اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ اگر یہ اللہ کے یہاں قبول کر لئے جائیں تو ہمیں عذابِ جہنم سے پناہ مل جائے گی لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہم بہشت کے بہترین انعامات کے لائق بھی ہو گئے۔ بہشت کی نعمتیں اس پر منحصر ہیں کہ ہم فرائض کے علاوہ واجبات، سنن، نوافل اور مندوبات و مستحبات سے بھی لَو لگائیں۔

اور جن بھلائیوں کا ہمیں سختی سے حکم نہیں دیا گیا انھیں بھی اختیار کرنے کی کوشش کریں۔

سادات کس گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ـــــ انکی رگوں میں کن اجداد کا خون رواں ہے ـــــ یہ احساس اپنی حقیقی معنویت کے ساتھ اگر ہمیں ہو جائے تو پھر فتوے کے بغیر ہی ہم یہ مان لینگے کہ جو مالِ زکوٰۃ ہمارے مال و منال کا دھوون ہے۔ وہ اس لائق نہیں کہ اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے میں بھیجا جائے۔ رشتہ دُور کا سہی ــــ مگر ہے تو رشتہ ـــــ شہہ والا سے حسب و نسب کی بعید تر نسبت بھی ایک بڑی شے ہے۔ اگر ہم نے اس مقدس نسبت کا احترام کیا تو کیا تعجب یہ جذبۂ احترام ہی ہماری نجات کا وسیلہ بن جائے۔

یہ ہمیں بھی علم ہے کہ آج کل بہتیرے سادات محض خانہ زاد سادات ہیں اور برائے نام ہی افراد رہ گئے ہیں جن کے بارے میں شجرۂ نسب کی صحت کا غالب گمان کیا جا سکے ـــــ تاہم اس کا حساب کتاب تو اللہ کے ذمے ہے وہ خود دیکھے گا کہ کن لوگوں نے قصداً اپنا نسب بگاڑا اور کون لوگ سہواً سادات بن بیٹھے۔ ہماری ذمہ داری بس اتنی ہے کہ جو لوگ سیّد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں کے غرباء کو مالِ زکوٰۃ نہ دیں بلکہ صدقۂ نافلہ یا قرضِ حسنہ دیں۔

صلہ رحمی

سوال:ـــ از مسعود علی انصاری۔ حیدرآباد دکن۔

حیدرآباد دکن میں ایک مسلم اوقاف بورڈ ہے جس کی بد انتظامی اور خورد بُرد کے واقعات ہر روز اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں ایک شہرت پسند عالم فاضل مالدار صاحب نے جو لاولد بھی ہیں ایک مسجد میں دینی مدرسہ قائم فرمایا ہے۔ جسمیں خود ہی ہر روز درس دیا کرتے ہیں اس مسجد میں آج تک نہ پیش امام ہے نہ موذن اور نہ خود پنج وقتہ نماز پڑھاتے ہیں جب دل میں آیا نماز پڑھنے آجاتے ہیں اور خود ہی نماز پڑھاتے ہیں اس مدرسہ کے لئے اپنی ساری جائداد اپنے ورثاء کو بے حق کر کے اوقاف میں دے دی ہے جب کہ ورثاء بہت ہی قریبی ہیں اور ان میں سے بعض ایک وقت کی بھی روٹی کے محتاج ہیں کہ جن کے گھر ایک وقت کا بھی کھانا مشکل ہی سے پکتا ہے۔

ان حالات میں آپ براہ کرم قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں تو دوسرے مالدار لوگوں کے لئے بھی راہ ہدایت ہو۔

جواب:ـــ

کسی ایسی مسجد کو جس میں امام اور مؤذن کا انتظام نہ ہو آباد کرنا اور وہاں دینی تعلیم کا مکتب قائم کرنا بہت ثواب کی بات ہے۔ اس اعتبار سے ان عالم صاحب نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ اگر خدانخواستہ اس کام میں شہرت طلبی کی نیت ہے تو اللہ تعالیٰ انھیں حسنِ نیت کی توفیق دے اور اگر رضائے الٰہی کی نیت ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے کہ آپ نے ان پر شہرت پسندی کا الزام لگایا۔

پنج وقتہ نماز پڑھانا ان کے ذمے تو نہیں ہے۔ اگر چند وقت بھی پڑھا دیتے ہیں تو یہ قابل تعریف بات ہے۔ جس وقت یہ تشریف نہ لائیں اور چند نمازی مسجد میں جمع ہو جائیں تو انھیں چاہیئے کہ جماعت کا وقت ہو جانے پر اپنے میں سے کسی کو امام بنا کر جماعت کر لیں۔ بہترین بات یہ تھی کہ مذکورہ عالم صاحب ایک مستقل امام کا انتظام فرما دیتے اور اس کی تنخواہ اپنی جیب سے دیتے۔ وہ اگر ایک جائداد وقف کر سکتے ہیں تو امام کی تنخواہ بھی دے سکتے ہیں اور یہ تو بہر حال کہہ ہی سکتے ہیں کہ اس جائداد کی آمدنی میں سے امام کی تنخواہ لگوا دیں۔ مسجد کو آباد کرنے کا عمل نیک ادھورا رہ گیا جب کہ پانچوں وقت کی جماعت کا اہتمام نہ ہو سکا۔

رہا جائداد کا وقف کرنا تو اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک فقہی دوسرا تعبدی۔ فقہی اعتبار سے تو ہر شخص اس کا مختار ہے کہ اپنی ساری جائداد مسجد کو وقف کر دے یا کسی کو تحفے میں دیدے غریب ورثاء کے ہوتے ہوئے بھی کسی نے اپنا سارا منقولہ و غیر منقولہ سرمایہ مسجد و مکتب کے نام وقف کر دیا یا کسی دوست کو بخش دیا یا عیش و عشرت میں بہا ڈالا تو قانون شرعی اسے مجرم قرار نہیں دیتا اور اسلامی عدالت اسے روکنے ٹوکنے کی مجاز نہیں وہ اپنے مال کا مالک و مختار ہے۔ وارثوں کا کوئی حق اس کے

مال میں جیتے جی نہیں ہے۔ اس اعتبار سے مذکورہ عالم صاحب پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

البتہ تعبّدی پہلو سے ان کا عمل قابلِ نظر ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ اعتدال و توسّط سے کام لو اور یک رُخے مت بن جاؤ۔ جس شخص کے پاس اچھی خاصی جائداد ہو اور غیر دولت مند قسم کے عزیز و اقربا بھی ہوں وہ اگر کسی مسجد یا دینی مکتب وغیرہ کے لئے مالی اعانت ضروری خیال کرتا ہے تو بیشک اسے اس کارِ خیر میں حصہ لینا چاہئے مگر اعتدال اور احتیاط کیساتھ اسے یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس کے جو عزیز و اقربا غریب ہیں انکی بقدرِ گنجائش مدد کرتے رہنا اس کی فلاحِ آخرت کے لئے بہت ضروری ہے۔ زکوٰۃ کے علاوہ کچھ دینے کو اللہ نے اگرچہ فرض نہیں کیا لیکن جو اللہ کی خوشنودی کے لئے کسی مسجد کے نام جائداد وقف کر رہا ہے — حالانکہ ایسا کرنا اس پر شریعت نے واجب نہیں کیا — تو کیا اس پر یہ لازم نہیں کہ صلہ رحمی (عزیزوں کی مدد اور حسن سلوک) پر خاص توجہ دے جب کہ اللہ کے رسولؐ نے صلہ رحمی پر بار بار توجہ دلائی ہے اور اس کی پروا نہ کرنے والوں کو سخت ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا ہے۔ بہت صاف سیدھی سادہ سی بات ہے کہ مال خرچ کرنے میں جس مسلمان کی نیت ثواب اور رضائے الٰہی کی ہوگی وہ لازماً یہ دیکھے گا کہ اللہ اور رسولؐ کے ارشادات کی روشنی میں کونسا مصرف زیادہ بہتر ہے۔ مسجد و مکتب کی امداد بھی یقیناً اچھا مصرف ہے۔ لیکن جبکہ ضرورتمند رشتہ دار بھی موجود ہیں تو انھیں مناسب مالی امداد دینا اور ان کی ضرورتوں میں کام آنا خدا کی خوشنودی کیلئے مقدم اور اہم تر عمل ہے لہذا نیک نیت مسلمان یہ کرہی نہیں سکتا کہ رشتہ داروں کو تو فقر و فاقے اور احتیاج کے کانٹوں پر تڑپتا چھوڑ دے اور اپنی ساری جائداد کسی مسجد کے نام لکھدے۔ اس طرح وہ آخرت کی دوہری باز پرس کے خطرے میں پھنس جائے گا۔ ایک یہ کہ ضرورتمند عزیزوں کی مالی مدد کرتے رہنا زندگی بھر اس کا تعبدی اور اخلاقی فریضہ تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کی موت کے بعد یہ جائداد ان غریب عزیزوں کا حق بننے والی تھی اس کی اس نے پروا نہ کی اور سب کی سب مسجد کو دے کر انھیں محروم کر دیا۔ بجا کہ قانونِ شرعی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا لیکن رضائے الٰہی اس سے اونچی چیز ہے اس کو حاصل کرنے کا شوق ہے تو ہمیں ہر معاملے میں یہ غور و فکر کرنا ہوگا کہ کب کون سا عمل دوسرے اعمال کے مقابلے میں اللہ اور رسولؐ کو زیادہ پسند ہے۔ کب کس راہ میں ثواب زیادہ ملتا ہے اور کب ایک اچھا عمل بھی گناہ بن جاتا ہے جبکہ اس کی وجہ سے ہم ایک زیادہ بہتر اور ضروری عمل کو ضائع کر دیں۔

ایک خرابی جو عام طور پر دیکھنے میں آرہی ہے یہ ہے کہ ہم اپنے بعض رشتہ داروں سے بہت معمولی معمولی باتوں پر روٹھ جاتے ہیں۔ کھنچ جاتے ہیں۔ متنفر ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کی احتیاج و ضرورت کا کوئی احساس ہم میں نہیں رہتا اور ان پر کچھ بھی گزرتی رہے ہم امداد کی طرف مائل نہیں ہوتے۔

یہ بہت برا ہے، بہت ہی برا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر ایک رشتہ دار شرابی کبابی بھی ہے۔ یا وہ ہماری برائیاں بیان کرتا پھرتا ہے۔ یا ہم سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہے۔ یا اس نے ہمیں نقصان پہنچایا ہے۔ ہر حال میں ہمارے اوپر سے یہ فریضہ ساقط نہیں ہوتا کہ جب وہ بھوکا ہو تو ہم اسے روٹی دیں۔ جب وہ ننگا ہو تو ہم کپڑا پہنائیں اور جب وہ کسی اور مصیبت میں ہمیں آواز دے تو ہم اس کی ساری برائیاں نظر انداز کر کے جائز حدوں تک اس کی مدد کریں۔ حد ہے کہ رشتہ دار اگر کافر بھی ہو جائے تو بوقتِ احتیاج مالی امداد کا فریضہ ہمارے ذمّے سے ساقط نہیں ہوتا۔ پھر بھلا کیا حشر ہوگا ہمارا اگر ہم نے کشیدگی یا غفلت و بے حسی کے باعث غریب رشتہ داروں سے تو منھ موڑے رکھا اور ہماری موت کے بعد جو حصّہ ہمارے مالِ متروکہ میں سے انھیں منجانب اللہ پہنچنے والا تھا اس سے بھی انھیں اس طرح محروم کر دیا کہ سارا مال و جائداد کسی مسجد میں دے دیا۔

عالم مذکور تک ہماری یہ معروضات پہنچا دیں تو کیا تعجب ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرنے کا ارادہ فرمالیں

اور جو کوتاہی عزیز و اقرباء کے سلسلے میں ان سے ہوگئی ہے اس کی اصلاح میں کوشاں ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ نیت ان کی نیک ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عمل میں نادانستہ خامی رہ گئی ہو۔

دو ترویحوں کے درمیان کیا ہو؟

سوال:- جمیل احمد۔ بستی متکلم

"فتاویٰ عالمگیری اردو" جز نمبر ۳ صفحہ ۱۹ میں مرقوم ہے اس کا خلاصہ یہ کہ "نماز تراویح میں دو ترویحوں کے درمیان ایک ترویحہ کی مقدار بیٹھنا مستحب ہے۔ اس وقفہ میں اختیار ہے خواہ تسبیح پڑھتے رہیں یا خاموش رہیں۔ مکہ کے لوگ اس وقفہ میں سات مرتبہ طواف کر لیتے ہیں۔ اور دو رکعت نماز پڑھ لیتے ہیں اور مدینہ کے لوگ اس درمیانی وقفہ میں چار رکعتیں نفل پڑھ لیتے ہیں۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ وقفہ میں ثواب حاصل کرنے کی غرض سے عبادت کرنا اور تسبیح کا ورد کرنا بدعت نہیں ہے۔ اَن پڑھ اور بے علم نمازیوں کو تعلیم دینے کی خاطر تسبیح کے الفاظ جاننے والے دو چار اشخاص مل کر بلند آواز سے تسبیح پڑھ لیا کریں تو کیا یہ صورت بدعت میں شمار کی جائے گی؟ نیز دو ترویحوں کے درمیان اجتماعی شکل میں دعا مانگنا کیسا ہے؟

جواب:-

تراویح میں ہر چار رکعات کے بعد کچھ دیر بیٹھنے کی حالت میں تسبیح کو تو کوئی بھی عالم بدعت نہیں کہتا بلکہ بعض فقہاء نے متعین طور پر ایک تسبیح بھی بتائی ہے جسے پڑھنا بہتر ہے۔ (سُبحانَ ذِی المُلکِ وَالملکوتِ الخ)

بدعت جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ تمام لوگ زور زور پڑھیں اور یہ بھی بدعت ہے کہ چند لوگ پڑھیں اور باقی حاضرین سنیں۔ ایک سے زیادہ آدمی اگر بلند آواز سے پڑھیں گے تو یہ آوازیں گڈ مڈ ہو جائیں گی لہذا تعلیمی نقطۂ نظر سے فقط ایک ہی صورت معقول ہو سکتی ہے کہ کوئی ایک شخص پڑھے اور باقی سب سنیں۔

لیکن یہ شکل بھی بدعت ہے کیونکہ سلف سے منقول اور

اسلامی خطوط نویسی بچوں بچیوں اور معمولی پڑھے لکھوں کے لئے مفید۔ خط لکھنے کا ڈھنگ اور سلیقہ ضروریاتِ زندگی میں سے ہے۔ اس کتابچے سے فائدہ اٹھائیے۔ ۶۰ نئے پیسے۔

تھوڑی دیر اہلِ حق کیساتھ جلیل القدر اسلاف کے ایمان افروز اور بیحد دلچسپ تاریخی حالات۔ حصہ اول و دوم کی مجموعی قیمت ایک روپیہ ۳۷ نئے پیسے۔

کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟ جماعت اسلامی پر کئے جانے والے بنیادی اعتراض کی حقیقت اس کتاب سے آپ نے سمجھ لی۔ جس نے اسے ملاحظہ نہ کیا ہو اب ملاحظہ کر لے (قیمت تین روپے)

اس کے اختتام پر جس کتاب کی امید دلائی گئی تھی الحمد للہ وہ بھی طبع ہو گئی ہے۔ اس کا مختصر نام ہے:-

الزامات کا جائزہ

اس میں ان الزامات کا منصفانہ جائزہ لیا گیا ہے جو جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر کبھی فتووں کی شکل میں اور کبھی کتابچوں اور اشتہاروں کی صورت میں لگائے جاتے رہے ہیں۔ اور اب بھی لگائے جاتے ہیں۔ پہلی فرصت میں پڑھیئے اور حق و باطل کا فرق محسوس کیجئے۔

اس کتاب کی قیمت ڈھائی روپے ہے۔ فوراً طلب فرمائیے۔ جو لوگ اسے اور "کیا جماعت اسلامی حق پر ہے" کو ایک ساتھ طلب فرمائیں گے انھیں ڈاک خرچ معاف کر دیا جائے گا۔

مکتبہ تجلّی۔ دیوبند (یو-پی)

ثابت نہیں۔ ان پڑھ اور بے علم نمازیوں کو تعلیم ہی دینی ہے تو یہ تعلیم دیجئے کہ وہ مذکورہ بالا تسبیح یا کوئی اور تسبیح خود ہی یاد کرلیں۔ اگر انھیں زائد ثواب کمانے کا شوق ہے تو کوئی چھوٹی سی تسبیح یا ذکر لینا کیا مشکل ہے۔

اور اگر یہ مشکل بھی ہو تو ان کے لئے یہی کافی ہے کہ خاموشی کے ساتھ سبحان اللہ یا درود شریف یا استغفار پڑھتے رہیں۔ ثواب مل جائے گا۔

کسی ایک یا چند اشخاص کا ایک تسبیح کو زور سے پڑھنا کبھی بھی اس بات کا ضامن نہیں کہ دوسرے لوگ اسے سنکر حفظ کرلیں گے جب حفظ نہیں ہوسکتی تو تعلیم کیا اور کیسے ہوئی۔

اجتماعی دعا بھی اس وقت بدعت ہے کیونکہ سلف سے منقول نہیں۔ دعا کے اوقات حدیث و قرآن اور آثار سلف سے معلوم ہو چکے ہیں۔ ان میں یہ وقت شامل نہیں ہے۔ آخر فرض عشاء اور ختم تراویح کے بعد دعاؤں کا وقت کیا کم ہے جو مزید وقت ہر چار رکعات کے بعد بھی نکالا جائے عبادات میں عقلی مینا کاری نہیں کرنی چاہیئے بلکہ سلف کے اقوال و اعمال کی پیروی کرنی چاہیئے۔ جب سلف سے اس وقت اجتماعی دعا ثابت نہیں تو آج اسے رواج دینا بدعت کے سوا کیا ہوگا۔ دعا یا تسبیح یا کوئی بھی کلمہ ثواب خاموشی سے پڑھ لینا ہی وہ طریقہ ہے جسے سلف نے اختیار کیا۔ ہم اسی میں محدود رہنے کو عافیت سمجھتے ہیں۔

اسلامی کلمے

سوال ۹:۔ (ایضاً)

ہماری ملت میں جو پانچ کلمے مشہور و معروف اور رائج ہیں کیا یہ قرآن و حدیث سے ماخوذ و ثابت ہیں۔ ان کلموں کا یاد کرنا اور یاد رکھنا ہر مسلمان پر کیا ہے؟ چند جدید کتابوں میں ششم کلمہ بھی موجود ہے۔

جواب ۹:۔

جی ہاں یہ پانچوں کلمے حدیث ہی سے ماخوذ ہیں۔ بعض نے ان کے علاوہ بھی شامل سلسلہ کر دیئے ہیں تو وہ بھی خود ساختہ نہیں بلکہ احادیث ہی سے لئے گئے ہیں۔

تمام مشہور کلموں کا یاد رکھنا ہر مسلمان پر فرض تو نہیں ہے، ایک بھی کلمہ یاد نہ ہو مگر توحید و رسالت پر دل سے ایمان ہو تو کسی نہ کسی درجے کا ایمان متحقق ہو جائے گا۔ لیکن یہ گیا گذرا درجہ ہے۔ مسلمان کے شایانِ شان یہی ہے کہ اس کو وہ بنیادی کلمات یاد ہوں جن میں ایسے عقائد کا بیان ہوا ہے جن کے بغیر ایمان و اسلام کا وجود ہی نہیں۔

شراب کی ایک قسم، بیئر

سوال ۱۰:۔ از عبدالخالق۔

شراب کی دوکانوں میں بیئر نامی ایک شراب فروخت ہوتی ہے جس کا بڑا شیشہ بھی نیا آدمی پینے کے بعد ہلکا سا بھی نشہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے پینے سے طبیعت کچھ بشاشش ہو جاتی ہے۔ لوگ اسے بطور ٹانک استعمال کرتے ہیں جو ہاضمہ کے لئے بھی بہت مفید سمجھی جاتی ہے۔

بعض مسلمان "بیئر" کو حرام کہتے ہیں اور بعض اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں محسوس نہیں کرتے اسے حلال قرار دیتے ہیں۔

براہ مہربانی بیئر کے بارے میں آپ کہیں اور سے مزید مستند معلومات حاصل کرکے اس کی حلت و حرمت کے بارے میں مطلع فرمائیں۔

جواب ۱۰:۔

شرعی قوانین میں عوام کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں لہٰذا اگر آپ کی طرف کچھ بے علم اور کم فہم مسلمان ایسے بھی ہیں جو بیئر کو جائز خیال کرتے ہوں تو ان کا ذکر تک فضول ہے۔ ذکر کرنا چاہیئے اہل علم کا کہ ان کی کیا رائے ہے۔ ساری دنیا کے مستند علماء میں ایک بھی نہ ملے گا جو بیئر کو جائز کہتا ہو۔ یہ بالکل غلط ہے کہ بیئر کی کوئی بھی مقدار نشہ آور نہیں ہوتی۔ اگر یہ بات ہوتی تو اسے شراب کی اقسام میں نہ شمار کیا جاتا حالانکہ پوری دنیا جانتی ہے کہ بیئر شراب ہی کی ایک قسم ہے۔ یہ ضرور ہے کہ

وہ تیز نہ ہوتی ہوگی مگر یہ کہنا بالکل لغو اور خلاف واقعہ ہے کہ کوئی کتنی بھی مقدار میں چڑھا جائے ہوش و حواس سکے قابو میں رہیں گے۔

رہا یہ کہ اسے پی کر بشاشت آتی ہے یا معدے وغیرہ کو تقویت پہنچتی ہے تو اس سے حرمت کے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قرآن نے تو خود کہا ہے کہ جوے اور شراب میں کچھ منافع بھی ہیں ـــ لیکن ان کی مضرت ان کے منافع سے بڑھ کر ہے۔ اسی لئے انھیں حرام قرار دیا گیا۔

فنی نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ شراب کا اصل جوہر وہ کیمیائی عنصر ہے جسے "الکوہل" کہتے ہیں یہی نشہ پیدا کرنے والا ہے۔ شراب کی کوئی بھی قسم ایسی نہیں ہے جس میں الکوہل کا نشہ آور جزو نہ پایا جاتا ہو۔ اسی لئے فقہاء نے بالاتفاق یہ اصول تسلیم کیا کہ جس چیز کی کثیر مقدار نشہ آور ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔ یہ حرمت نشہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ تھوڑے سے الکوہل کا استعمال طبیعت کو قدرتاً زیادہ کے استعمال پر مائل کرے گا اور وہ شدید نفرت جو ایک مسلمان کو نشہ آور چیزوں سے ہونی چاہئیے بالیقین مضمحل ہو جائے گی۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ زنا سے دور رکھنے کے لئے اجنبیہ کے بدن کو چھونا بلکہ اس کی طرف گھور کر دیکھنا بھی حرام قرار دیا گیا تاکہ یہ چیزیں فتنہ کی مبادیات نہ بن جائیں۔ اسی طرح الکوہل ملی ہوئی ہر چیز کی قلیل سے قلیل مقدار بھی حرام کی گئی تاکہ طبیعت کثیر کی طرف مائل ہو اور تنفر کا جذبہ سرد نہ پڑ جائے۔

بیئر کے بعض اجزا چاہے دوسری تیز شرابوں سے کچھ مختلف ہوں لیکن یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ اس میں الکوہل شامل کیا جاتا ہے۔ خواہ یہ شمولیت اس طرح پر ہو جیسے تیل میں الگ سے خوشبو ملائی جاتی ہے یا اس طرح پر ہو کہ تیار کرنے کا عمل ہی الکوہل پیدا کر دیتا ہو۔ جو بھی شکل ہو۔ اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ بیئر میں الکوہل ہوتا ہے اور اسی لئے اس کا شمار "شراب" کی اقسام میں ہے لہٰذا جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ نہ کہا جائے کہ بعض اشیاء میں قدرتی طور پر الکوہل پیدا ہو جاتا ہے مگر شریعت نے انھیں حرام نہیں کیا مثلاً گنّا یا انگور کہ الکوہل ان میں پیدا ہو کر سُرخ رنگت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان اشیاء کو حرام اس لئے نہیں قرار دیا گیا کہ یہ الکوہل انسان نے اپنی ترکیب سے پیدا نہیں کیا نہ یہ آپ سے آپ بڑھ کر اس مرحلہ تک پہنچ سکتا ہے کہ ہوش و حواس مختل کر دے ـــ اگر پہنچ سکتا ہو تو اس مرحلے میں اسے بھی حرام قرار دیں گے ـــ لیکن نہ پہنچنے کی صورت میں اس کی حرمت اس لئے غیر منطقی ہے کہ اسے پیدا کرنے میں انسان کے ارادے اور ترکیب کو دخل نہیں۔ اور جو شخص سرخ انگور یا گنڈیری کھاتا ہے وہ بھی ہرگز یہ نیت نہیں رکھتا کہ اسے کھا کر وہ الکوہل کے فوائد اور سرور انگیزی سے مستفید ہوگا۔

اس کے برخلاف شراب کی ہلکی سے ہلکی قسم میں بھی اس کے تیار کرنے والے الکوہل لازماً شامل کرتے ہیں اور اسے پینے والے بھی قطعی طور پر یہ نیت رکھتے ہیں کہ اسکی "الکوہلیت" سے مستفید ہوں۔ یہ نیت نہ ہو تو انھیں ضرورت ہی کیا ہے کہ سادہ پانی یا سستے شربت کی بجائے بہت سا پیسہ شراب پر خرچ کریں۔ آپ خود ہی تسلیم کرتے ہیں کہ بیئر سے طبیعت میں بشاشت آتی ہے ـــ یہ بشاشت کیا ہے۔ وہی الکوہل کی سرور انگیزی کا ابتدائی مرحلہ۔ اور معدے وغیرہ کو بھی اس سے فائدہ پہنچتا ہو تو اس کے سوا کیا سمجھا جائے کہ قرآن نے شراب کے جن منافع کو قابلِ نظر انداز قرار دے کر حکم حرمت صادر کیا تھا انھیں ہم فوقیت دے رہے ہیں۔ معدۂ جگر کے لئے دنیا کے اور ہزار ٹانک ہیں۔ یہی کیا ضرور ہے کہ بیئر استعمال کی جائے۔

ویسے یہ دعویٰ بھی مضحکہ خیز ہی ہے کہ بیئر بس نفع ہی نفع دیتی ہے نقصان کچھ نہیں دیتی۔ امریکہ، انگلینڈ اور فرانس وغیرہ کے معاشرتی حالات اور تمدنی کوائف پر جن کی نظر ہے وہ

عرصہ ہوا جان چکے ہیں کہ شراب کی کسی بھی قسم کے استعمال سے فوری طور پر جو توانائی، ترنگ اور جوش کی کیفیات حاصل ہوتی ہیں یا ہاضمہ تیز ہوتا محسوس ہوتا ہے وہ محض ایک فریب ہے۔ ایک حباب آسا منفعت ہے جو ہمارے نظام بدن سے بہت بڑی قیمت وصول کرتی ہے۔ فوائد تو فوری طور پر محسوس ہو جاتے ہیں لیکن مضرتوں کے جو گہرے زخم اعضا پر لگتے ہیں ان کا فوری احساس نہیں ہوتا۔

بہرحال طبی نقطۂ نظر کی بحث تو الگ ہے۔ فقہی نقطۂ نظر یہی ہے کہ جس جوہر کا نام "الکوہل" ہے وہ حلال چیزوں کے دائرے میں نہیں آسکتا۔

لبرل اسلام

سوال :- از عبدالرشید۔ ضلع جلگاؤں۔

اپریل ۱۹۶۵ء کا الفرقان تو آپ نے پڑھا ہوگا۔ جناب وحید الدین خاں صاحب نے مسٹر اے، اے فیضی صاحب کی کتاب "لبرل اسلام" کا تعارف کرایا ہے۔ آپ فیضی صاحب کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں؟

۱۹۵۰ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے کہ جناب فیضی صاحب قاہرہ سے ہندوستان آئے تھے اور مالیگاؤں (مہاراشٹر) میں ایک تقریر کے دوران آپ نے بتایا تھا کہ:-

"میں نے مصر کے لوگوں کو بتلایا کہ چودہ سو سال پہلے ایک انسان نے کہا تھا کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں اور ہمارے ملک ہندوستان میں ایک شخص ایسا ہوا ہے (مہاتما گاندھی) جو کہتا ہے کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔"

تو مصر کے لوگوں نے خوشی اور استعجاب کا اظہار کیا اور مہاتما جی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایسے مسلمان کے لئے مفتیانِ دین کا کیا فیصلہ ہے؟

جواب :-

اپریل کا الفرقان اس وقت سامنے نہیں۔ نہ یہ یاد ہے کہ فیضی صاحب کی کتاب کے بارے میں کیا لکھا گیا تھا لیکن آپ کا سوال اتنا اہم محسوس نہیں ہوا کہ رسالہ کے فائل الٹ پلٹ کر اپریل کا الفرقان نکالا جائے فیضی صاحب اُن جانے پہچانے لوگوں میں ہیں جن کے اسلام کا حدود اربعہ باخبر لوگ خوب جانتے ہیں اور مجرد یہی بات ان کے طرزِ فکر کا بنیادی تعارف کرانے کے لئے بالکل کافی ہے کہ انھوں نے سید الابرار خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے ساتھ مہاتما گاندھی جی کا تذکرہ نتھی کر دیا۔ حالانکہ گاندھی جی دنیاوی اعتبار سے کتنے ہی بڑے لیڈر رہے ہوں لیکن دینی اعتبار سے ان کی یہ حیثیت ہرگز نہیں کہ اسلام اور کفر کی حقیقت سمجھنے والا کوئی بھی مسلمان ان کے کسی قول کو مدح و تحسین کے اُس سیاق میں بیان کرے جس میں انبیاء و رسل کے ارشادات بیان کئے جاتے ہیں۔

پھر جو فقرے آپ نے نقل کئے وہ اگر درست نقل ہوئے ہیں اور مقرر کا مافی الضمیر واقعتہً وہی ہے جو ان فقروں سے ظاہر ہوتا ہے تو مفتیانِ دین اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان فقروں کا ادا کرنے والا صریح طور پر توہینِ رسول کی ناپاک جسارت کر رہا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ مقرر صاحب کے اعصاب پر گمراہ کن قسم کی وطن پرستی اور قوم پروری کا بھوت سوار ہے اس لئے وہ ظاہر فریب الفاظ کے ہیر پھیر سے یہ تاثر دینے کی ناپاک کوشش کر رہے ہیں کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطۂ نظر نسبتاً غیر روادارانہ تھا اور گاندھی جی کا زاویۂ نظر اس کے بالمقابل زیادہ روادارانہ، وسیع اور ترقی یافتہ ہے!

اگر سچ مچ یہی تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے تو یہ خالص بکواس اور ہذیان سے زیادہ کچھ نہیں۔ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ یہ بات اس پیرائے میں تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہے کہ تمام انسان ایک باپ — حضرت آدمؑ — کی اولاد ہیں لہٰذا ان میں سے کسی کو پیدائشی طور پر پاک اور کسی کو ناپاک تصور کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان میں اصل رشتہ برادری ہی کا ہے اور ایک ہی باپ کے مختلف بیٹوں کا گوشت پوست اور بدن یکساں طور پر ایک ہی حکم

میں ہے۔ نیز انسانی حیثیت سے ان سب کے حقوق بھی ایک ہی جیسے ہیں۔

اسی واقعاتی اصل کو حضورؐ نے بایں طور بھی ظاہر فرمایا کہ الخلق عیال اللہ (مخلوق اللہ کا کنبہ ہے) اور قرآن کریم نے بھی متعدد بار اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ تم سب کا باپ ایک ہی ہے۔ تم سب مجرد انسانی حیثیت میں یکساں حقوق اور مساوی احترام و عزت کے مستحق ہو۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (اور ہم نے عزت دی اولادِ آدم کو اور سوار کرایا اس کو خشکی اور تری میں اور عطا کی اس کو نفیس و پاکیزہ چیزیں اور برتری دی اسے ہم نے اپنی بہت سی مخلوقات پر)

پھر یہ کیا فضول گوئی ہوئی کہ "ہندوستان میں ایک شخص ایسا ہوا ہے جو کہتا ہے کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں" جو کچھ گاندھی جی نے کہا وہ تو محض خوشہ چینی ہے باغِ اسلام کی۔ وہ اپنی چھوت چھات کی ماری قوم کو کل جس سچائی کا درس دے رہے تھے وہ سچائی تو ہزاروں برس گذرے تمام رسولوں کی زبان پر انداز بدل بدل کر گونجتی رہی ہے اور پورے چودہ سو برس قبل اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسے اتنی وضاحت اور قطعیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ بہرے بھی صاف سن سکتے ہیں۔ فرق بس یہ ہے کہ گاندھی جی بیچارے تو اپنے مشن میں ناکام گئے۔ ان کی قوم نے انسانی مساوات کی بات ایک کان سُنی اور دوسرے کان اُڑا دی۔ کروڑوں انسان گاندھی جی کے دیس میں کل بھی ایسے تھے اور آج بھی ایسے ہیں اور شاید ہزاروں برس ایسے ہی رہیں گے جنھیں انہی کے ہم مذہب جسمانی طور پر ناپاک اور پیدائشی طور پر نیچ سمجھتے ہیں۔ جن کے چھو جانے سے چیزیں ناپاک ہو جاتی ہیں۔ جنھیں بے شمار مندروں میں قدم رکھنے اور بے شمار کنوؤں سے پانی لینے تک کی اجازت نہیں۔ جو شودر اور اچھوت کہلاتے ہیں۔ اس کے برخلاف محمد عربیؐ اپنے مشن میں کامیاب گئے کہ چھوت چھات کا سخت جاہلانہ اور دشمن انسانیت تصور ان کی امت میں زندگی کا ایک سانس تک نہ لے سکا۔ اپنے ہم مذہبوں کے بارے میں تو درکنار دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے بھی چھوت چھات نہیں کرتے۔ ان کی وسعتِ قلبی اور انسانیت دوستی کا عالم یہ ہے کہ ایک ہندو بھنگی یا چمار کو لاؤ اور اسے غسل کرادو تاکہ نجاست ظاہری اس کے بدن سے دور ہو جائے۔ پھر کہو کہ اپنے ہی صاف ستھرے برتنوں میں اپنے ہی گھر کا پکا ہوا کھانا اتار لائے ۔۔۔ اگر اس کھانے میں کوئی حرام شے ملی ہوئی نہیں ہے تو تم دیکھو گے کہ عامر عثمانی کو اسکے ساتھ مل کر کھانے میں کوئی احتراز نہ ہوگا۔ اسے کہتے ہیں انسانیت کا دیانت دارانہ احترام اور یہی وہ اسپرٹ ہے جسے پیدا کرنے کے لئے اللہ اور اس کے رسولوں نے اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں کیونکہ وہ ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ انھیں جسمانی اور خلقی طور پر پاک اور ناپاک، ذلیل اور معزز، کمین اور شریف کی تقسیم کا نشانہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ہاں اچھے اور بُرے اعمال اور صحیح و غلط عقائد کے لحاظ سے ان کی تقسیم اور درجہ بندی ضرور کی جاسکتی ہے ۔۔۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (تم میں سے زیادہ عزت دار بس وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے)

اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ تمام انسانوں کو ایک ہی باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے بھائی بھائی قرار دینے کی بات گاندھی جی کی "ایجاد" نہیں ہے۔ اب اس جہالت پر نظر کیجئے جو مقرر کے اس قول سے ظاہر ہو رہی ہے کہ:۔

"چودہ سو سال پہلے ایک انسان نے کہا تھا کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں"

گویا مقرر کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ بات فقط ایک انسان کی کہی ہوئی نہیں بلکہ انسانوں کے خالق باری تعالیٰ جل شانہ نے بالکل واضح اور محکم الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (تمام اہل ایمان آپس میں

بھائی بھائی ہیں)

اب اگر مقرر کے خیال میں یہ "قول" گاندھی جی کے ارشاد سے کمتر ہے تو یوں کہئے کہ وہ گاندھی جی کو نعوذ باللہ خاتم الرسلؐ ہی سے نہیں خدا سے بھی زیادہ حکیم و دانا اور وسیع النظر باور کرانا چاہتے ہیں!

تمام انسانوں کو حضرت آدمؑ کے رشتے سے بھائی بھائی قرار دینے کے باوجود قرآن نے یہ تخصیص کیوں کی کہ تمام اہلِ ایمان بھائی بھائی ہیں۔ یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں دنیا جانتی ہے کہ "اخوت" کا لفظ جہاں ایک قانونی اور لغوی مفہوم رکھتا ہے وہیں اس کا ایک جذباتی اور نفسیاتی مفہوم بھی ہے۔ جب سارے انسانوں کو بھائی بھائی کہا گیا تو رشتۂ اخوت کے فقط لغوی مفہوم کی رعایت مدِ نظر رکھی گئی تاکہ بعض بنیادی اور انسانی حقوق میں تمام بنی آدم مساوی قرار پائیں۔ مگر جب اہلِ ایمان کو بھائی بھائی کہا گیا تو رشتۂ اخوت کا جذباتی اور نفسیاتی مفہوم پیش نظر رکھا گیا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک اجنبی شخص سے ہمارے قلب و ذہن کو وہ تعلق نہیں ہوتا جو اپنی ماں کے پیٹ سے ولادت پائے ہوئے "بھائی" سے ہوتا ہے۔ حالانکہ حضرت آدمؑ کے رشتہ سے یہ اجنبی بھی ہمارا بھائی ہی ہے۔ اجنبی تو درکنار ہمیں اپنے دور کے عزیزوں اور روز کے ملنے جلنے والوں سے بھی وہ گہرا انس ہرگز نہیں ہوتا جو سگے بھائی بہن سے ہوتا ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ رشتۂ اخوت کے مدارج اور مراتب کا فرق ملحوظ نہ رکھا جائے۔ اسلام چونکہ فطری مذہب ہے اور ناقابلِ عمل خیالی فلسفوں سے ہٹ کر وہ حقائق و واقعات پر اپنی تعلیمات کی بنیاد رکھتا ہے اس لئے تمام انسانوں کو اصلاً ایک دوسرے کا بھائی قرار دینے کے باوجود وہ اس امرِ واقعہ سے چشم پوشی نہیں کرتا کہ خون کا بہت قریبی اشتراک دو حقیقی بھائیوں میں جو انس و محبت پیدا کرتا ہے وہ دو غیر حقیقی اور محض قانونی و منطقی بھائیوں میں متصور نہیں ہو سکتا ——— اور اسی طرح ایمان کا اشتراک دو مومنوں میں جو روحانی اور قلبی ربط پیدا کر سکتا ہے وہ دو ایسے انسانوں کے مابین ممکن نہیں جن میں سے ایک اپنے دل و دماغ، اپنے نفس، اپنی خواہشات اور اپنی ساری متاعِ حیات کو محمد عربیؐ کی غلامی میں دے چکا ہو اور دوسرا محمد عربیؐ کو خدا کا آخری رسول تک ماننے کو تیار نہ ہو۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب مسلمان واقعی مسلمان تھے۔ جب ان کا ایمان مطلوبہ معیار کا ایمان تھا تو وہ ٹھیک اسی جذباتی اور نفسیاتی مفہوم میں ایک دوسرے کے بھائی تھے جس کا تذکرہ اِنّما المؤمنون اخوۃ میں کیا گیا ہے۔ ان کے لئے خون کے رشتے بھی ایمان کے رشتے کے مقابلے میں ماند پڑ گئے تھے۔ اپنے سگے بھائی کی مصیبت پر ہمیں جو دکھ پہنچتا ہے اس سے بھی زیادہ دکھ انھیں اُس شخص کی مصیبت پر پہنچتا تھا جو ایمان کے رشتے سے ان کا بھائی بن چکا ہو چاہے رہنے والا کسی ملک کا ہو اور تعلق کسی بھی قبیلے اور خاندان سے رکھتا ہو۔ ایسا بہت ہوا ہے کہ خون کے تعلق اور ایمان کے رشتے ٹکرا گئے۔ باپ ایمان لے آیا ہے مگر بیٹا کافر ہے۔ بیٹا مسلمان بن گیا ہے مگر باپ شرک سے نہیں ہٹا۔ بھائی محمدؐ کی غلامی قبول کر چکا ہے مگر دوسرا بھائی کفار کی صف میں ہے۔ ایسی تمام حالتوں میں خون کا رشتہ ہار گیا اور ایمان کی پیدا کردہ جذباتی اخوۃ اس درجہ غالب آئی کہ باپ نے بیٹے کو، بیٹے نے باپ کو، بھائی نے بھائی کو اور بھتیجے نے چچا کو میدانِ جنگ میں تہِ تیغ کر دیا۔ گویا قرآن کی یہ آیت فقط ایک تلقین و تعلیم نہ تھی کہ اہل ایمان بھائی بھائی ہیں بلکہ ایک امرِ واقعہ تھی۔ حقیقت تھی۔ سچائی تھی۔ ——— آج اگر اس کی حیثیت فقط ایک ہدایت اور تلقین کی نظر آ رہی ہے تو یہ در اصل ہمارے زوالِ ایمانی کی وجہ سے ہے۔ ہم نے ایمان کو ہر دوسری شے پر مقدم رکھنے کے عوض محض ایک ذیلی و ضمنی اور قومی و وراثتی شے بنا لیا

ہم ان بدبختوں کی صف میں جا پہنچے جن سے خطاب کرتے ہوئے باری تعالیٰ فرماتا ہے بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (تم تو حیاتِ دنیاوی کے پیچھے دوڑنے والوں میں ہو) اسی لئے ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ آیت مذکورہ میں اہل ایمان کو بس ایک تعلیم دی گئی ہے کہ ایکدوسرے کو بھائی سمجھو، حالانکہ حق یہ ہے کہ جو لوگ سچ مچ مومن ہو جائیں وہ تو آپ سے آپ بالکل فطری اور نفسیاتی طور پر ایک دوسرے کو بھائی سمجھنے ہی نہیں لگتے محسوس بھی کرنے لگتے ہیں۔

محمدؐ کی غلامی خون کے رشتوں سے بالا ہے
یہ رشتہ دنیوی قانون کے رشتوں سے بالا ہے

پوری زندگی کو گھیر لینے والے عقائد کی یکسانی اور فکر و نظر کی مکمل ہم آہنگی جو بھائی چارہ اور اخوت پیدا کرتی ہے اس کے مفہوم میں تمام انسان کبھی بھائی بھائی نہیں ہوئے نہ ہو سکتے ہیں۔

گاندھی جی اس خاص اخوت کی بات کیا کرتے جبکہ ان کی قوم نے ان کے عام اخوت کا سبق ہی رد کر دیا۔ وہ بار بار اسی لئے تو اس سبق کو دہرانے پر مجبور رہے کہ اگلے کسی سبق کا موقع ہی نہ آسکا۔ اسلام بار بار اس سبق کو اس لئے نہیں دہراتا کہ اس کے پیروؤں نے تو پہلے ہی دن اسے دل و دماغ کی مکمل آمادگی کے ساتھ لبیک کہدیا تھا۔ پھر اسے کیا ضرورت تھی کہ تحصیل حاصل میں سر مارتا رہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ ایک باپ کی اولاد ہونے کے اعتبار سے جو عام رشتۂ اخوت تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے اس کے تقاضوں کو دل وجان سے تسلیم کرتے ہیں ہم مسلمان کفر و اسلام کا امتیاز روا نہیں رکھتے اور ایک ہی مٹی سے بنے ہوئے انسانوں میں بعض کو نیچ اور اچھوت اور "ناپاک چمڑی والا" خیال کر کے انسانیت کی توہین نہیں کرتے۔

مصر کے لوگوں نے اگر مقرر کے دعوے کے مطابق ان کے متذکرہ فقروں پر خوشی اور استعجاب کا اظہار کیا تو یا تو وہ مقرر کا مطلب نہیں سمجھے یا پھر اظہار طنز یہ ہوگا۔ طنز بعض دفعہ اتنا لطیف ہوتا ہے کہ اس کا ادراک کرنا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ مصری مسلمان اتنے جاہل اور بے دین تو بہر حال نہیں ہو سکتے کہ وہ ایسی یاوہ گوئی پر جھومنے لگیں جس میں گاندھی جی کو سرورِ کائناتؐ سے بھی بڑھ کر حقیقت شناس باور کرایا گیا ہو اور قرآنِ حکیم کی محکم آیت کو فقط محمدؐ کا قول کہا گیا ہو۔ نعوذ باللہ من ہذا الکفریات

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی
تفہیم القرآن
جلد اوّل مجلد اعلیٰ بارہ روپے
جلد دوئم " پندرہ روپے
جلد سوئم " سترہ روپے
تفسیر سورۂ احزاب چھٹی جلد کی بھی ساڑھے چار روپے میں طلب فرمائیں۔
مکتبہ تجلّی۔ دیوبند (یو۔پی)

دُرِّ نجف

کچھ تازہ خطوط

مکمل پتوں کے ساتھ۔ تاکہ جس کا جی چاہے تصدیق کرلے۔

۱۶؍اکتوبر ۶۵ء

شریمان جی نمستے!

آپ کا بنایا ہوا سرمہ دُرِّ نجف ہم نے استعمال کیا اس کے استعمال سے ہماری آنکھیں صاف رہتی ہیں اور بینائی میں بھی اضافہ ہوا ہے جس سے ہر چیز صاف دکھائی دیتی ہے

سرمہ فائدہ مند ہونے کی وجہ سے آپ سے پھر منگوا رہے ہیں۔ از راہِ کرم چھوٹی دو شیشیاں بذریعہ وی پی مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجدیجئے۔

پتہ:- بابو راؤ۔ موہن راؤ۔ مقام و پوسٹ گونڈی۔
ضلع اورنگ آباد (مہاراشٹر)

۵؍نومبر ۶۵ء مکرمی۔ السلام علیکم

...... میں اپنی بینائی کی خرابی سے گھبرا گیا تھا اور ملازمت کرنی دوبھر معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن دُرِّ نجف کے استعمال سے بفضلہ تعالیٰ یہ نتیجہ ہوا کہ نوکری حسن و خوبی سے چلا رہا ہوں۔ تین روپے والی دو شیشیاں اور اپنی خاص جستی سلائی وی پی سے ارسال فرمائیں۔

پتہ:- سید رضا کریم رضوی۔ اسسٹنٹ ناظر سول کورٹ
بھاگلپور (بہار)

۱۸؍اگست ۶۵ء

مکرمی تسلیم!

...... اس سے قبل چھ تولہ دُرِّ نجف سرمہ منگوا چکا ہوں متعدد حضرات کو دیا جنھوں نے استعمال کے بعد بہت تعریف کی۔ میں خود ایک ماہ سے لگاتار استعمال کر رہا ہوں اور اس کے فوائد محسوس کرکے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ —— دُرِّ نجف کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے استعمال سے آنکھوں سے جو پانی گرتا تھا تھم گیا اور پہلے سے نظر کی روشنی بھی بڑھ گئی۔

دو شیشی ایک ایک تولہ کی اور ایک چھ ماشے کی مع تین عدد خاص سلائی وی پی سے بھیج دیں۔

پتہ:- محمد زین العابدین۔ بیڑی کنٹرکٹر۔ خلاصی محلہ۔
پوسٹ جھاجھا ضلع مونگیر (بہار)

۷؍اکتوبر ۶۵ء مکرمی السلام علیکم آپ کے سرمہ کی مانگ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ آخر کار لوگوں کے اصرار پر چھ شیشیاں ایک تولے والی مع چھ سلائیوں کے بذریعہ وی پی مطلوب ہیں۔ اس سے قبل چودہ شیشیاں منگائی تھیں۔

پتہ:- شیخ حسین ناظم جماعت اسلامی ایچوڑہ۔ پوسٹ ایچوڑہ
ضلع عادل آباد

ایک تولہ پانچ روپے

چھ ماشے تین روپے

محصول پیکنگ ڈیڑھ روپیہ

کوئی سی بھی تین شیشی ایک ساتھ طلب کرنے پر ڈاک خرچ معاف

کمال یہ ہے کہ اپنے جملہ فوائد کے باوجود آنکھوں میں لگتا اور کرکتا نہیں ہے۔ اسی لئے مائیں اسے بچوں کی آنکھوں میں بلا تکلف ڈالتی ہیں۔

ہماری خاص جستی سلائی بھی ساتھ طلب کیجئے۔ صرف ۱۵ پیسے۔

دار الفیض رحمانی۔ دیوبند (یو۔پی)

تاجر حضرات شرائط ایجنسی طلب فرمائیں

تسبیح کے دانے

سادگی و پُرکاری

جو کوئی مشین بناتا ہے وہی اُس کے چلانے کا طریقہ اور بناؤ بگاڑ کی بات بھی جانتا ہے۔ جو مشینیں باہر سے آتی ہیں اُن کے ساتھ بنانے والوں کی طرف سے چلانے کے طریقہ کے بارے میں ہدایات بھی آتی ہیں — انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے بنایا ہے ماں کے پیٹ میں رکھ کر بنایا ہے جہاں کسی دوسرے کا ہاتھ بھی نہیں لگ سکتا بلکہ نظر بھی نہیں جا سکتی - وہی اللہ جانتا ہے کہ انسان کی مشین کس طرح استعمال ہونے میں اس کا بناؤ اور تعمیر ہے اور کس طرح استعمال ہونے میں اس کا بگاڑ اور تخریب ہے۔ اُس نے پیغمبروں کو یہی بتانے کے لئے بھیجا اور سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا - اب جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق اپنے کو استعمال کرے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو اُن کے طریقہ کے خلاف اپنے کو استعمال کرے گا وہ ناکام ہوگا اور اسکی یہ ناکامی پوری طرح آخرت میں ظاہر ہوگی جو انسانوں کے لئے اصلی اور دائمی عالم ہے۔ (مولانا محمد یوسف رح)

اجتماعی ملکیت

اجتماعی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے تمام زمیندار ختم کر دیئے گئے اور ایک وحدہٗ لاشریک زمیندار سارے ملک کی زمین کا مالک ہوگیا۔ سارے کارخانے دار اور تجار اور مستاجر بھی ختم ہوگئے اور ان سب کی جگہ ایک ایسے سرمایہ دار نے لے لی جو ذرائع پیداوار کی ہر قسم اور ہر صورت پر قابض ہوگیا۔ اور پھر اسی کے ہاتھ میں سارے ملک کی سیاسی طاقت بھی مرکوز ہوگئی - یہ ہے کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ - اب اگر روس میں بظاہر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اس پوری معاشی، تمدنی اور سیاسی طاقت کو استعمال کر رہے ہیں وہ عام آبادی کے ووٹوں ہی سے منتخب ہوا کرتے ہیں تو کیا فی الواقع اس کے معنی جمہوریت کے ہیں؟ سارے روس میں کس کی ہمت ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے مقابلہ میں ووٹ مانگنے کے لئے اٹھ سکے؟ اور اگر کوئی جرأت کرے بھی تو وہ سرزمین روس میں کھائے گا کہاں سے؟ اور اپنی آواز اٹھائے گا کس پریس سے؟ اور اپنی بات سنانے کے لئے ملک میں سفر کن ذرائع سے کرے گا؟ بلکہ یہ سب کچھ کرنے سے پہلے اس کو زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ طے کرنے میں دیر کتنی لگے گی؟ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی ملکیت کے نظام میں حکومت کے پاس اتنی طاقت جمع ہوجاتی ہے جو تاریخ انسانی میں کبھی کسی چنگیز اور ہلاکو اور زار و قیصر کے پاس بھی جمع نہیں ہوئی تھی جو گروہ ایک دفعہ اس طاقت پر قابض ہوجائے پھر اس کے مقابلے میں اہلِ ملک بالکل بے بس ہوجاتے ہیں۔ کسی قسم کی بگڑی ہوئی حکومت کو بدل دینا اس قدر مشکل نہیں ہے جس قدر ایک بگڑی ہوئی اشتراکی حکومت کو بدلنا مشکل ہے

اس نظامِ حکومت میں برسرِ اقتدار پارٹی ملک کی مجموعی زندگی کے لئے جو منصوبہ (PLAN) بناتی ہے اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے وہ پریس کو، ریڈیو کو، سنیما کو،

مدرسے کو، پوری انتظامی مشینری کو اور پورے ملک کے معاشی کاروبار کو ایک خاص نقشے کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ اس منصوبے کی کامیابی کا انحصار ہی اس پر ہے کہ تمام ملک میں سوچنے اور رائے قائم کرنے کا فیصلہ کرنے والے دماغ صرف ۵ چند ہوں جو مرکز میں بیٹھے منصوبہ بنا رہے ہیں۔ باقی سارا ملک صرف عمل درآمد کرنے والے دست و پا پر مشتمل ہو جو "تعمیل و ارشاد" میں چون وچرا تک نہ کریں۔ تنقید اور نکتہ چینی اور رائے زنی کرنے والوں کے لئے اس نظام میں جیل اور تختۂ دار کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہے اور اگر ایسے دخل در معقولات دینے والے کو ملک بدر کر دیا جائے تو یہ گویا اس کے ساتھ بڑی رعایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں خود کمیونسٹ پارٹی کے بڑے بڑے سربرآوردہ کارکنوں اور لیڈروں تک کو جن کی محنتوں اور قابلیتوں ہی کی بدولت اشتراکی تجربہ کامیابی کی منزل تک پہنچا" موت اور حبس دوام اور جلاوطنی کی سزائیں دے ڈالی گئیں۔ صرف اسلئے کہ انھوں نے برسرِ اقتدار گروہ سے اختلاف کی جرأت کی تھی پھر اشتراکی اخلاقیات کا طرفہ تماشا ہے کہ جس کو بھی اختلاف کے جرم میں پکڑا گیا اس پر طرح طرح کے ہولناک الزامات بے تحاشا لگا دیئے گئے اور اشتراکی عدالتوں میں بھی یہ ایک حیرت انگیز کرامت پائی جاتی ہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی جس کو بھی ان کے ملزموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتی ہے، وہ استغاثے کے عین منشاء کے مطابق اپنے جرائم کی فہرست خود ہی فرفر سناتا چلا جاتا ہے اور کچھ دبی زبان سے نہیں بلکہ پورے زور و شور کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ وہ بڑا غدّار اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ اور روس کی آستین کا سانپ ہے!

پھر چونکہ یہ نظام انفرادی ملکیتوں اور مذہبی طبقوں کو زبردستی کچل کر قائم کیا گیا ہے اور ابھی وہ سب لوگ دنیا سے اور خود روس کی سرزمین سے مٹ نہیں گئے ہیں جن کے جذبات حسیات اور حقوق کی قبر پر یہ قصر تعمیر ہوا ہے اس لئے کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ کو ہر وقت روس میں جوابی انقلاب کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ علاوہ بریں اشتراکی حضرات یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان کے انکار کے باوجود انسانی فطرت نام کی ایک چیز موجود ہے جو انفرادی نفع طلبی کا جذبہ رکھتی ہے اور وہ ہر وقت زور لگا رہی ہے کہ پھر انفرادی ملکیت کا نظام واپس آجائے۔ انھی وجوہ سے ایک طرف کمیونسٹ پارٹی خود اپنے نظام کو آئے دن "جُلّاب" دیتی رہتی ہے تاکہ جن لوگوں میں "رجعت" کی ذرا سی بو بھی پائی جائے انھیں صاف کیا جاتا رہے اور دوسری طرف پارٹی کی حکومت سارے ملک میں جوابی انقلاب کے خطرات، امکانات، بلکہ شبہات اور وہم وگمان تک کو مٹا دینے کیلئے ہر وقت تُلی رہتی ہے۔ اس نے جاسوسی کا ایک وسیع نظام قائم کر رکھا ہے جس کے بے شمار کارکن ہر ادارے، ہر گھر اور ہر مجمع میں "رجعت پسندوں" کی بو سونگھتے پھرتے ہیں۔ اس جاسوسی کے پُراسرار جال نے شوہروں اور بیویوں تک کے درمیان شک وشبہ کی دیوار حائل کر دی ہے۔ حتیٰ کہ ماں باپ کے خلاف خود ان کی اولاد تک سے جاسوسی کی خدمت لینے میں دریغ نہیں کیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ قیمت جو دو وقت کی روٹی اور بُرے وقت کی دستگیری کے لئے اشتراکی روس کے باشندوں کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ کیا واقعی اس قیمت پر یہ سودا سستا ہے؟ بلاشبہ ایک فاقہ کش آدمی بسا اوقات بھوک کی شدت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ جیل کی زندگی کو اپنی مصیبت بھری آزادی پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہاں کم از کم دو وقت کی روٹی، تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کی جگہ تو نصیب ہوگی۔ مگر کیا اب پوری نوعِ انسانی کے لئے فی الواقع یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اسے روٹی اور آزادی دونوں ایک ساتھ نہیں مل سکتیں؟ کیا روٹی ملنے کی اب یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ ساری روئے زمین ایک جیل خانہ ہو اور چند کامریڈس اس کے جیلر اور وارڈر ہوں؟ (مولانا مودودی)

اسفل السافلین

ادھر بادشاہ (اکبر) نے تخت پر قدم رکھا اُدھر

کڑھائی میں پڑا پڑا اور ہیون ہونے لگا۔ تلا دان میں منوں سونا اور جواہرات چڑھتا اور دربار میں بچھا در ہوتا۔

عالم بھی ایسے ایسے جمع ہو گئے کہ قاضی نظام بدخشی ایک بڑا فاضل صاحبِ تصنیف تھا جس کا خطاب قاضی خاں تھا۔ چنانچہ سجدۂ زمین بوس کا مصنف وہی تھا۔ مُلّا عالم کابلی اس پر افسوس کیا کرتا تھا کہ ہائے! یہ نکتہ مجھے پہلے نہ سوجھا۔

ایک بالاخانہ خواب گاہ کہلاتا تھا، اکبر خود اس میں بیٹھتا تھا اور ایک برہمن کو چارپائی پر بٹھا کر اس میں رسیاں باندھتے اور کھینچ لیتے تھے، وہ معلّق رہتا اور آفتاب، سیاروں اور دیوتاؤں کے منتر سکھایا کرتا۔ چنانچہ تسخیر آفتاب کا منتر اور اُس کے ایک ہزار نام سیکھ کر پڑھنے شروع کئے اکبر مشرق کو منھ کر کے سویا کرتا تھا کہ آفتاب خدا کا مظہر ہے (معاذ اللہ) اور زراعت و میوہ بلکہ کل کاروبار عالم کے اس پر منحصر ہیں۔

غرض محلوں میں رانیاں تھیں، دربار میں راجا تھے چند روز کے بعد قبلۂ عالم سے مہابلی بن گئے اسلام کی رسموں کو سلام کہہ کے ڈاڑھی کے ساتھ رخصت کر دیا۔ عیدوں سے زیادہ جشن نوروزی اور ہندی تہواروں کی دھوم دھام ہونے لگی ـــــ حکم ہو گیا کہ قدیم رسم فارس کے بموجب آتشکدہ بنے اور آگ اس کی ہرگز نہ بجھنے پائے۔ چنانچہ ابوالفضل اس کے مہتمم ہوئے۔ دفتر سے سنہ ہجری موقوف ہو کر سنہ الٰہی اکبر شاہی قائم ہوا۔ بلکہ کل اکبری آئین کا نام آئین الٰہی تھا خوشامدی سب بڑھے ہوئے جن تھے۔ انھوں نے اپنا تاریخی تجربہ ذہن نشین کیا کہ ہزار برس کے بعد دنیا میں ایک اولوالعزم خلیفہ اور صاحب مذہب پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ خلیفہ اللہ ہیں۔ (قصص ہند۔ از مولوی محمد حسن آزاد)

کمال حکمت کا نمونہ ـــــ پانی!

وہٹیکو چیمبرز نے اپنی کتاب "شہادت" میں ایک معمولی سے واقعے کا ذکر کیا ہے جو نہ صرف اُس کی زندگی کے رُخ مُڑنے کا باعث بنا بلکہ پُوری انسانیت کے معاملات و مسائل پر اس کا اثر پڑا۔ وہ بیٹھا ہوا اپنی چھوٹی بچی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر بچی کے کان پر جا پڑی اور غیر شعوری طور پر وہ اس کی ساخت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ یہ کتنی ناممکن سی بات ہے کہ اتنی پیچیدہ اور نازک چیز اتفاقاً وجود میں آجائے۔ یہ یقیناً پہلے سے سوچے سمجھے نقشے اور منصوبے کے تحت ہی ممکن ہو سکی ہو گی لیکن پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ اگر وہ یہ مان لے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہو گا کہ اسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا ہے کیوں کہ اگر اس کائنات کو تخلیق مان لیا جائے تو خالق کا ماننا لازم آتا ہے اور یہ ایک ایسا تصور تھا جسے قبول کرنے کے لئے اس کا ذہن آمادہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اس بات پر مزید غور کرنے کی ہمّت ہی نہ کی۔

میں اپنے پروفیسروں اور ریسرچ کے سلسلے میں اپنے رفقائے کار میں سے کئی سائنس دانوں کے بارے میں جانتا ہوں کہ علم کیمیا اور طبیعات کے مطالعہ و تجربات کے دوران میں انھیں بھی متعدد مرتبہ اسی طرح کے احساسات سے دوچار ہونا پڑا اگرچہ ان پر اس کا اتنا شدید ردعمل نہ ہوا ہو جتنا کہ وہٹیکر چیمبرز پر ہوا تھا۔

میں اپنے گرد وپیش اس غیر نامیاتی عالم میں ہر طرف ایک نظم اور ایک منصوبہ کار فرما پاتا ہوں اور یہ باور کرنا میرے لئے کسی صورت میں ممکن نہیں کہ یہ مختلف جوہروں کے کسی اتفاقی امتزاج و اتصال سے وجود میں آگیا ہو گا۔ میرے نزدیک یہ نظم و ترتیب کسی حکیم کی گہری حکمت کی مظہر ہے اور اسی حکیم و علیم ذات کو میں خدا کہتا ہوں۔

ایک عالم کیمیا کو جو چیز سب سے زیادہ متأثر کرتی ہے وہ عناصر کی دَوری ترتیب ہے۔ علم کیمیا کے میدان میں نووارد طالب علم سب سے پہلے جس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے وہ عناصر میں نظم اور دَوریت ہے۔ اس نظم کو مختلف ناموں اور طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن بالعموم اس دوری جدول کے نظم کی دریافت کا سہرا ایک روسی عالم کیمیا و سائنس داں مینڈلیف کے سر سمجھا جاتا ہے۔ عناصر کی اس ترتیب کی روشنی میں نہ صرف

معلوم عناصر اور ان کے مرکبات کا مطالعہ ممکن ہو گیا ہے بلکہ اس کی وجہ سے انسان میں یہ تجسس بھی بڑھا ہے کہ وہ ان عناصر کو دریافت کرے جو ابھی تک نہاں خانۂ قدرت میں مستور ہیں کیونکہ ان کے وجود کا اندازہ جدول کی ترتیب میں خالی مقامات سے ہو چکا ہے۔

علمائے کیمیا آج بھی نامعلوم اور نئے مرکبات کی خصوصیات اور ان کے ردِّ عمل کا پتا لگانے کے لئے اسی دوری جدول سے کام لیتے ہیں اور اس تحقیق میں ان کی کامیابی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اس غیر نامیاتی عالم میں نہایت اعلیٰ درجہ کا نظم اور بہترین سلیقہ پایا جاتا ہے۔

لیکن ہم اپنے گرد و پیش جو نظم و ترتیب پاتے ہیں، یہ محض قدرت کاملہ کا کوئی قہرمانی مظاہرہ نہیں بلکہ اسکے اندر خیر خواہی اور بھلائی کی گہری چاشنی پائی جاتی ہے اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ فطرت کے اٹل قوانین کی طرح حکمت الٰہی کا بھی منشاء و مقصود مخلوق کی فلاح و بہبود ہی ہے اپنے ماحول پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ ان قوانین فطرت اور اس حکمتِ الٰہی سے روگردانی کی اگر کوئی کوشش کی جاتی ہے تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر پانی کو لے لیجئے، اس کا وزن ضابطہ ۱۸ ہے۔ اس وزن کی بنیاد پر فوراً بتایا جا سکتا ہے کہ معمولی حرارت یا دباؤ کے زیر اثر یہ گیس میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ امونیا کا ضابطہ ۱۷ ہے۔ کرۂ ہوا کے دباؤ کے تحت منفی ۳۳ سینٹی گریڈ درجۂ حرارت پر بھی گیس بن جاتا ہے۔ ہائیڈروجن سلفائیڈ جو دوری جدول میں پانی سے بڑی قریبی مناسبت رکھتا ہے۔ اس کا وزن ضابطہ ۳۴ اور وہ منفی ۵۹ درجہ سینٹی گریڈ پر گیس بن جاتا ہے۔ اب یہ بات کہ پانی کس طرح ہمیشہ سیّال شکل میں رہتا ہے نہایت ہی اہم اور قابلِ غور حقیقت ہے۔

پانی کی دوسری خصوصیات بھی اس سے کم دلچسپ نہیں اور ان پر اگر بحیثیت مجموعی غور کیا جائے تو وہ اس کائنات میں ایک نظم اور ضابطے کی موجودگی کا بجائے خود نہایت کافی بیّن ثبوت ہیں۔ بڑے پیمانے پر اس حقیقت پر غور کیا جا سکتا ہے کہ پانی اس کرۂ زمین کے تین چوتھائی حصے کو گھیرے ہوئے ہے اور اس کا حرارت اور موسمی حالات کے تغیر و تبدل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر پانی میں یہ مختلف النوع خصوصیات بہم نہ ہوتیں تو یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے حرارت میں کتنا تباہ کن اُتار چڑھاؤ ہوا کرتا۔ پانی کو پگھلنے کے لئے کافی سخت حرارت کی ضرورت ہے۔ اس کی سیّال کیفیت کافی عرصے تک برقرار رہ سکتی ہے۔ اور اسے بھاپ میں تبدیل کرنے کے لئے کافی تیز حرارت مطلوب ہوتی ہے اور اس طرح گویا اس میں موسموں کے تغیر و تبدل کے شدید اثرات کو جذب و زائل کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت پیدا کر دی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ موسموں اور حرارت کے تغیر و تبدل کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے یہ محیّر العقول صلاحیت پانی میں موجود نہ ہوتی تو زمین پر انسان کے لئے زندہ رہنا انتہائی مشکل اور کٹھن ہو جاتا۔

اس کے علاوہ پانی کی اور بھی کئی خصوصیات ہیں جو مجھے یہ ماننے پر مجبور کرتی ہیں کہ نہ صرف کسی بڑے حکیم و دانا کی تخلیق ہے بلکہ وہ خالق اپنی مخلوق پر بڑا مہربان اور اس کا بڑا خیر خواہ ہے۔ پانی وہ واحد معلوم مادہ ہے جو جمنے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے یہ چیز بقائے حیات کے لئے زبردست اہمیت کی حامل ہے اسی کے سبب یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا ہے اور دریاؤں سمندروں اور جھیلوں کی تہ میں نہیں بیٹھ جاتا کہ آہستہ آہستہ سب کو ٹھوس اور منجمد کر دے۔ یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے پانی کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر ہی رہتا ہے اور اس کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں اور جوں ہی موسم بہار آتا ہے برف فوراً پگھل جاتا ہے۔

پانی کی بعض اور نہایت دلچسپ خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔ مثال کے طور پر پانی کی سطح پر نہایت شدید تموّج اور حرکت جاری رہتی ہے جو مٹی سے اجزائے غذائی کو اوپر

لاتی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہے اور اس طرح نباتات کی نشوونما میں بیش قیمت امداد بہم پہنچاتی ہے۔ اس میں چیزوں کو حل کرنے اور گلانے کی صلاحیت ہر معلوم مادّے سے زیادہ ہے اور اس بناء پر یہ ہمارے خون کا ایک اہم جزو بن کر ہماری جسمانی زندگی کے نشوونما اور بقاء میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف درجہ ہائے حرارت سے اس پر شدید بخاراتی دباؤ پڑتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ اس تمام علاقے میں سیّال کا سیّال رہتا ہے جہاں بقائے حیات کے لئے اس کا سیّال رہنا ضروری ہے۔

بے شمار سائنس دانوں نے پانی کی ان حیرت انگیز خصوصیات کا مطالعہ کیا ہے اور ان عجائب کی توجیہ کے سلسلے میں متعدد نظریات گھڑے ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ عقل لڑا کر ہم چاہے اس بات کو جان لیں کہ یہ سب کچھ کس طرح ہوتا ہے۔ لیکن یہ بتانا ہمارے بس سے باہر ہے کہ یہ سب کیوں ہوتا ہے۔ پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ معاملہ صرف پانی کی عجیب وغریب خصوصیات تک محدود نہیں اس کائنات میں اور نہ جانے کتنے بے حد و حساب مادے ہیں جن کی خصوصیات اتنی حیران کن ہیں کہ انسانی عقل ان کے مظاہر دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے ان معجزاتِ فطرت کی میں نے تو ایک توجیہ پالی ہے۔ ایک نہایت اطمینان بخش توجیہ ــــ اور وہ توجیہ یہ ہے کہ کائنات کا یہ بے مثل نظم وضابطہ ایک حکیم کی حکمت کا کرشمہ ہے اور اس کائنات کا وجود ایک عظیم خالق کی کاریگری کا شاہکار ہے اور اس کائنات میں صرف یہی نہیں کہ ہر چیز کی منصوبہ بندی نہایت جامع اور مکمل ہے بلکہ اس منصوبہ بندی کے پیچھے خالقِ کائنات کی اپنی مخلوق کے لئے رحمت و شفقت اور محبت وخیر خواہی بھی پوری طرح نمایاں ہے۔

(از:- ٹامس ڈیوڈ پارکس (پی۔ ایچ۔ ڈی) محقق کیمیا)

واحد مذہب

مذاہب میں جو تصورات مشترکہ نظر آتے ہیں۔ افسوس ہے کہ سطحی نظر رکھنے والے ان کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے محض سطح پر نگاہ ڈال کر چند غلط مقدمات کو چند غلط طریقے سے ترتیب دے کر غلط نتائج نکال لیتے ہیں، حالانکہ دراصل یہ اشتراک ایک اہم حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ پتہ دیتا ہے کہ درحقیقت یہ تمام مذاہب ایک ہی اصل سے نکلے ہیں۔ ان تمام تصورات اور تعلیمات کا مبدا ایک ہے، کوئی ایک ذریعۂ علم ہے جس نے انسان کو مختلف ممالک، مختلف اوقات اور مختلف زبانوں میں ان مشترک صداقتوں سے روشناس کیا کوئی ایک بصیرت ہے جو مشرق ومغرب کا بُعد رکھنے والے سیکڑوں ہزاروں برس کا فصل رکھنے والے لوگوں کو حاصل ہوئی اور اس بصیرت سے وہ سب کے سب ایک ہی قسم کے نتائج تک پہنچے لیکن مذاہب جب اپنی اصل اور اپنے مبدا سے دور ہو گئے تو ان میں کچھ خارجی تصورات اور اجنبی معتقدات نے راہ پالی اور چونکہ یہ بعد والی چیزیں اس مشترک مبدا اور مشترک بصیرت سے ماخوذ نہ تھیں بلکہ مختلف طبائع مختلف رجحانات اور مختلف علمی وعقلی مراتب رکھنے والے انسانوں کی طبع زاد تھیں اس لئے انھوں نے مشترک بنیادوں پر جو عمارتیں تیار کیں وہ اپنے نقشوں اور اپنی وضع وہیئت میں بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہو گئیں۔

پس حق اور صداقت کا اگر حکم لگایا جا سکتا ہے تو اس اصل مشترک پر جو تمام مذاہب میں یکساں پائی جاتی ہے نہ کہ ان مختلف تفصیلی صورتوں اور ہیئتوں پر جن میں موجودہ مذاہب پائے جاتے ہیں۔

پس یہ حقیقت ہے کہ "اسلام" مذاہب میں سے ایک مذہب نہیں ہے، بلکہ نوعِ انسانی کا اصل مذہب یہی ہے اور باقی سب مذاہب اس کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں دنیا کے دوسرے مذاہب میں جو کچھ "حق" اور "صادق" پایا جاتا ہے وہ اسی اصل اسلام کا بچا کھچا اثر ہے جو سب کے یہاں آیا تھا اور اختلاف میں ۲

۲ گم کر دیا گیا! (تفہیمات ـــ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

عربی کے شائقین کو مژدہ

عربی زبان مسلمانوں کی سرکاری زبان ہے۔ قرآن اسی زبان میں اُترا ہے۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت تاثیر، لطافت و حسن اور دلکشی کو محسوس کیا ہی نہیں جا سکتا جب تک کہ زبان عربی پر عبور نہ ہو۔ اردو ترجموں سے بس مطلب تو سمجھا جا سکتا ہے اور وہ بھی غیر مکمل۔ اسی لئے وہ لوگ مبارک ہیں جنھیں عربی سیکھنے کا موقع مل جائے۔

ضروری نہیں کہ آپ جس بستی میں رہتے ہیں وہاں کوئی عربی سکھانے والا بھی میسر آجائے۔ اسی کمی کا احساس کرکے ہم نے خط و کتابت کے ذریعہ عربی سکھانے کی خدمت اپنے ذمے لی ہے۔ عربی ویسے تو آج بھی وہی ہے جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے تھی لیکن زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بہت سے تغیرات بھی ہوئے ہیں۔ نئی اصطلاحیں بنی ہیں۔ گوناگوں اسالیب داخل ہوئے ہیں۔ صرف و نحو کی متعدد جزئیات میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ تغیر و تبدل کا یہ زمانی عمل نہ تو کلّی طور پر اچھا ہے نہ کلّی طور پر برا۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ اچھے پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے قدیم عربی کے بنیادی محاسن اور تاریخی اوصاف کا پورا پورا تحفظ کیا جائے اور طلباء کو ایسی عربی سکھائی جائے جو تمام قدیم عظمتوں اور خوبیوں کی امانت دار ہو۔

آپ ذیل کے پتے پر خط لکھ کر ہماری خدمات کے متعلق جملہ تفصیلات معلوم کر سکتے ہیں۔

عبدالودود شکرانوی البہاری۔ المدرس الاول لتعلیم العربی القدیم

مدرسہ حسینیہ ولی ڈیہہ۔ ڈاکخانہ مانگو (جمشید پور)

شِری چھاگلا ــــــ بنام اُمتِ مسلمہ

ہمارے دادے کے دادا اگر ہندو یا سکھ یا عیسائی رہے ہوں تو ہمارے لئے عار کی کوئی بات نہیں۔ عار کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اس عالمِ رنگ و بو کا سب سے بڑا انسان خدا کا آخری پیغمبر محمدؐ بن عبداللہ ایک مشرک دادے کا پوتا اور ایک مشرک باپ کا بیٹا تھا — اسی یکتائے روزگار انسان کو ہم نے اپنا آقا مانا۔ اسی کے لائے ہوئے دین کو اپنی پوری زندگی کے لئے مینارۂ ہدایت تسلیم کیا اور خیر و شر کے سارے ہی معیار اسی سے لئے۔

مستزاد یہ کہ یہی بلند و برتر انسان، اپنی ملت کو جس ابراہیمؑ بن آذر سے منسوب کرتا ہے وہ ابراہیم بھی ایک رفیع الشان پیغمبر ہونے کے باوجود کسی مومن و مسلم کا بیٹا نہ تھا بلکہ ایک بت تراش کا نورِ نظر تھا۔

پھر آگے بڑھیئے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ چار جلیل القدر افراد بھی جنھیں دنیا چار خلفاء کے نام سے جانتی ہے اور جن سے بہتر و برتر انسان خاتم الانبیاءؐ کے بعد پیدا نہیں ہوئے مومن باپوں کے بیٹے نہیں تھے بلکہ کفر و شرک ہی پر مرنے والے اب و جد کی اولاد تھے۔

ایسی صورت میں کسی مسلمان کے لئے بھلا یہ بات کیوں باعثِ ننگ ہونے لگی کہ اس کے اجداد میں پانچ سات سو برس قبل کوئی کافر و مشرک ہو گذرا ہو۔ پانچ سات سو برس کی دوری تو الگ رہی اگر عین باپ بھی مشرک یا ملحد ثابت ہو جائے تو اس سے نہ کوئی توہین ہوتی ہے نہ قباحت لازم آتی ہے۔ توہین اور قباحت کیسی۔ اس پر تو تہہِ دل سے خدا کا شکر ادا کیا جا سکتا ہے کہ یہ مسلمان فقط نسلی اور رسمی مسلمان نہیں بلکہ ایسا شعوری اور حقیقی مسلمان ہے جس نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کافر و مشرک باپ کی جہنمی راہ سے ہٹنے کی جرأت کی ہے۔ اس کا اسلام وہ مالِ وراثت نہیں جو بلا کسی سعی و جہد کے اس کی جھولی میں آ گرا ہو بلکہ یہ ایسی متاع ہے جس کے حصول میں اس نے فکر و دراست کا ایک طویل ذہنی سفر کیا ہے جس کی خاطر اس نے اقرباء کی ترچھی نظریں برداشت کی ہیں۔ ماحول کا طعن سہا ہے۔ عافیت کو خطرے میں ڈالا ہے۔

حاصل یہ کہ اسلام وہ مشعل نور ہے جس کی روشنی باپ دادوں کے کفر و شرک سے کبھی داغ دار نہیں ہوتی، لہٰذا جب بھارت کے وزیرِ تعلیم شری چھاگلا یہ فرماتے ہیں کہ:۔

"ہر پاکستانی اصلی مسلمان نہیں بلکہ نومسلم ہے۔
ہر پاکستانی کی رگوں میں ہندو خون دوڑ رہا ہے۔"

تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی بھی پاکستانی یا بھارتی مسلمان کی آنکھیں شرم سے جھک جائیں۔ البتہ اس پہلو پر غور و فکر کی دعوت ہم اہلِ نظر کو ضرور دیں گے کہ پاکستان کے وزیرِ خارجہ مسٹر بھٹو کی بد کلامی کے جواب میں شری چھاگلا کا یہ ارشاد کیا واقعتہً کوئی شریفانہ اور دانشمندانہ جواب ہے یا اس کی حیثیت تاریخ اور واقعات و حقائق کو

منہ چڑھانے کی ہے۔ ؟

آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ اخبار اور ریڈیو کی اطلاع کے مطابق مسٹر بھٹو نے ۲۶ راکتوبر والے سلامتی کونسل کے اجلاس میں بڑی غیر مہذب اور ناشائستہ زبان استعمال کی تھی۔ دشمن کے منہ میں خاک۔ یہاں تک بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے ہم بھارتیوں کو "کتا" کہہ دیا تھا۔ استغفراللہ ایسی بدزبانیاں جیسی بھی لائقِ مذمت ہیں محتاجِ بیان نہیں بڑا ہی کمینہ پن ہے کہ آدمی سنجیدہ استدلال کی بجائے بازاری باتوں پر اُتر آئے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر حیرت کی بات یہ ہے کہ سلامتی کونسل میں تہذیب و شائستگی کے سارے ہی جغادری ائمہ موجود تھے جن کا دعویٰ یہ ہے کہ دنیا کو تہذیب انھوں نے سکھائی ۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی منہ سے نہ پھوٹا کہ اے بدزبان مقرر یہ کیا لفنگا پن ہے۔ ایک نے بھی تو احتجاج نہ کیا کہ بھٹو زبان کو لگام دیں ورنہ ہم اس گندی فضا میں بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ روس پہلے تو ویٹو لئے پھرتا تھا۔ اب اتنا بھی نہ کر سکا کہ یاوہ گو مقرر کو ٹوک ہی دیتا۔ خدا جانے یہ ہمارے ستاروں کی خرابی ہے یا پیشوایانِ تہذیب کی بے حسی کہ بھٹو بھری محفل میں لفنگوں کی زبان استعمال کرتے رہے اور معزز سامعین کو اُبکائی تک نہ آئی۔

تقدیر تو تقدیر ہی ہے۔ ہم بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ بھٹو کی مبینہ یاوہ گوئی پر ہمارے وزیر اعظم یا وزیر خارجہ یا وزیر تعلیم جتنا بھی برا مانیں بجا ہے۔ ان حضرات کی تخصیص ہم نے ان کی منصبی عظمت کے باعث کی ورنہ برا تو ہم پینتالیس ۴۵ کروڑ انسانوں نے یکساں طور پر مانا ہے۔ ہم سب بھارتی ہیں اور مسٹر بھٹو نے بلا استثناء بھارتیوں ہی کی شان میں گستاخی کی ہے۔

لیکن بُرا مانتے ہوئے شری چھاگلا نے جو نقد جواب صادر فرمایا گفتگو اس پر ہونی چاہئیے اس لئے کہ ان کے جواب کی جراحت سارا پاکستان ہی کو ہدف نہیں بناتی، ہم تمام بھارتی مسلمان بھی یکساں طور پر اس کے شکار ہوگئے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شری چھاگلا نے ایک ایک پاکستانی مسلمان کا شجرۂ نسب کھنگال کر یہ سرمن نہیں الاپا ہے کہ ان کی رگوں میں ہندو خون دوڑ رہا ہے، بلکہ ان کی الاپ کا منطقی سنگِ بنیاد یہ جاہلانہ اور من گھڑت تخیل ہے کہ اس برِّ صغیر میں جو بھی مسلمان اب سے ہزار برس پہلے بطور فاتح داخل ہوئے تھے وہ اپنی نسلیں چھوڑے بغیر مرکھپ گئے اور پھر یہاں جو بھی امتِ مسلمہ پھیلتی بڑھتی گئی وہ لازماً کسی نہ کسی ہندو سے رشتۂ نسب ضرور رکھتی ہے۔

ہم آغاز ہی میں کہہ چکے ہیں کہ — اگر ایسا ہوتا تو اس کے اظہار و انکشاف پر مسلمانوں کو قطعاً شکایت نہ ہوتی نہ اسے وہ اپنے لئے توہین کا باعث سمجھتے لیکن ایسا چونکہ نہیں ہے اس لئے ہم بجا طور پر شکایت کر سکتے ہیں کہ پاکستانی وزیر کی یاوہ گوئی کا انتقام لینے کے جوش میں مسٹر چھاگلا نے ایسی لغو اور بے تکی غلط بیانی کیوں کی جو ہندو پاک کے بے شمار مسلمانوں کے لئے فحش گالی کا درجہ رکھتی ہے۔

الف کے باپ کا نام آپ مکھن لال بتائیں تو یہ کوئی گالی نہیں اگر واقعہ بھی یوں ہی ہو۔ لیکن اگر واقعہ یوں نہ ہو بلکہ الف ارشاد حسین کا بیٹا ہو تو مکھن لال کو اس کا باپ بتانا گویا کنائے کی زبان میں اسے "حرامی" قرار دینا ہے۔ مسٹر چھاگلا طویل زمانے تک جج رہے ہیں۔ آج وزیر تعلیم ہیں۔ کیا اتنے بلند مناصب کے باوجود وہ ہندوستان کی تاریخ اور یہاں کے نسلی حقائق سے بس اتنی ہی آگہی رکھتے ہیں کہ یہاں کے ہر مسلم خاندان کا شجرۂ نسب لازماً کسی ہندو گھرانے سے جا ملتا ہے!

وائے بے بصری۔ اس برصغیر کے تمدن اور تاریخ کا کوئی بھی ذی ہوش طالب علم اس معلوم واقعے سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا کہ یہاں صرف چند ہزار فوجی مسلمان ہی نہیں آئے تھے بلکہ ان کے پیچھے بے شمار دیگر مسلمانوں کی آمد کا بھی سلسلہ قائم رہا تھا۔ فارس،

ایران، عراق، شام، مصر، افغانستان کہاں کہاں سے مسلمانوں کا ورود نہیں ہوا۔ وہ آتے گئے بستے گئے۔ ان کی نسلیں پھیلتی بڑھتی رہیں۔ ان کے اَخلاف میں بیشمار ایسے ہیں جن کے نسب نامے دستاویزی شکل میں محفوظ چلے آرہے ہیں۔ بے شمار ایسے ہیں جنھیں اپنا شجرۂ نسب زبانی یاد ہے۔ شری چھاگلا جیسے آدمی کو اس سے بے خبر تو نہ ہونا چاہیئے کہ ہند و پاک میں لاتعداد مسلمان اپنے کو سیّد، صدیقی، فاروقی، عثمانی کہتے ہیں اور ہزاروں اپنا انتساب ایرانی یا افغانی خانوادوں کی مختلف شاخوں سے کرتے ہیں۔ اس کا مطلب بدیہی طور پر یہی تو ہوا کہ انھیں اپنے نسب نامے میں کسی ہندو بزرگ کی شرکت سے ہرگز اتفاق نہیں بلکہ ان کا دعویٰ ہے کہ نسلی طور پر وہ غیر ہندی خاندانوں کے چشم و چراغ ہیں۔

پھر کیا شری چھاگلا کوئی ٹوٹی پھوٹی دلیل بھی اپنے اس دعوے کی فراہم کر سکتے ہیں کہ یہ سب دروغ باف ہیں اور ان کی رگوں میں لا محالہ کسی نہ کسی ہندو کا خون ضرور گردش کناں ہے! ___ ایک شخص زید کا بیٹا ہو لیکن ظاہر یہ کرے کہ وہ طاہر کا بیٹا ہے تو مفہوم یہ برآمد ہوگا کہ وہ خود کو "حرامی" کہنے میں مضائقہ نہیں سمجھتا۔ ہمارے خیال میں ایسے بے حیا لوگ کم ہی ہو سکتے ہیں جو آسانی سے خود کو ایسی گالی دے سکتے ہوں ___ مگر شری چھاگلا یہ دعویٰ فرما رہے ہیں کہ وہ سارے مسلمان جو خود کو غیر ہندی اجداد سے منسوب کرتے ہیں ایسے ہی بے حیا ہیں کہ انھوں نے اپنے شجرۂ نسب سے کسی ہندو باپ دادا کو نکال کر اس کی جگہ کسی مسلمان کا نام رکھ دیا ہے اور اس طرح بلا تکلف خود کو گالی دے لی ہے

شری چھاگلا نے جو کچھ کہا ہے وہی اگر کسی جاہلِ مطلق نے کہا ہوتا تو خیال کیا جا سکتا تھا کہ کہنے والا اپنے قول کے منطقی نتائج اور مضمرات کا شعور نہیں رکھتا۔ اسے نہیں معلوم کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کے کیا معنی نکلتے ہیں۔ لیکن شری چھاگلا جیسے عالم فاضل کے متعلق یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ انھیں اپنے ارشادات کے مفہومِ لازم کا شعور نہ ہوگا۔ وہ بہت چلتے ہوئے ہیں۔ وہ پختہ کار اور سرد و گرم چشیدہ ہیں۔ ان کی زندگی عدالتِ عالیہ کی کرسی پر بیٹھ کر بال کی کھال نکالنے میں گذری ہے پھر اس کے سوا کیا سمجھا جائے کہ انھوں نے بھٹو کی بدکلامی کا بدلہ صرف پاکستان سے نہیں بلکہ دانستہ طور پر ہند و پاک کی تمام امتِ مسلمہ سے چکانا چاہا ہے۔ انھیں اسلام سے جو ضد، مسلمانوں سے جو کد، اسلامی روایات اور کلچر سے جو عناد ہے وہی ان کے ارشاد میں صاف صاف جھلک رہا ہے۔

لفظ "نو مسلم" کا استعمال بھی خوب رہا۔ پھر جب یہ وضاحت بھی شری چھاگلا نے ساتھ ساتھ دیدی کہ نو مسلم "اصلی مسلمان" نہیں ہوتے۔ تو بات اور بھی طرحدار بن گئی۔ "اصلی" کا لفظ اب تک تو "نقلی" کے مقابلہ میں سنتے آئے تھے لیکن "نو مسلم" کے مقابلے میں اس کا استعمال شری چھاگلا ہی کی جودتِ طبع کا شاہکار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر وہ مسلمان بھی "نو مسلم" کہے جا سکتے ہیں جن کے نسب ناموں میں چھاگلا صاحب کے مفروضے کے مطابق ہزار آٹھ سو سال پہلے کسی ہندو کی شمولیت رہی ہو تو پھر ساری ہی امتِ مسلمہ کے پاس سوائے "نو مسلموں" کے رہ کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرامؓ تقریباً سبھی نو مسلم تھے۔ ایسے نو مسلم جن کے باپ ہی غیر مسلم نہ تھے بلکہ وہ خود بھی شرک ہی کی گود میں پلے بڑھے تھے اور عمر کا خاصا حصہ شرک ہی رہتے ہوئے کاٹا تھا۔ پھر ان کی اولادیں بھی نو مسلم کے سوا کیا کہی جا سکتی ہیں جب کہ شری چھاگلا کے نزدیک ہر وہ مسلمان "نو مسلم" ہے جس کی کسی بھی پشت میں غیر مسلم جدِ امجد کا شمول رہا ہو۔ "نو مسلم"

ہونے کی صورت میں یہ بھی طے ہوا کہ وہ "اصلی مسلمان" نہ تھے لہٰذا سیدھا ساحل یہ نکلا کہ اصلی مسلمان کبھی کوئی ہوا ہی نہیں - یہ پوری امت نومسلموں کا جمّ غفیر ہے۔

محاورے کا جہاں تک تعلق ہے "نومسلم" صرف اُس مسلمان کو کہا جاتا ہے جو پیدا ہوا ہو خانوادۂ کفر میں اور پھر عمر کے کسی حصے میں باضابطہ مسلمان بن گیا ہو۔ مجازاً اس لفظ کا اطلاق ان مسلم خاندانوں پر بھی کر لیا جاتا ہے جن کے اسلام کا سلسلہ بس باپ دادا یا پردادا سے چلا ہو۔ بہت توسّع کیجئے تو پانچ چھ پشتوں تک شمار کر لیجئے۔ اس سے زیادہ مدت گذر جانے پر یہ اصطلاح بے جان ہو جاتی ہے۔ پل بھر کے لئے مان بھی لو کہ اس برِّ صغیر کے سارے ہی مسلمانوں کا سلسلۂ نسب ہزار آٹھ سو سال --- یا چار پانچ سو سال قبل کسی ہندو بزرگ سے جا ملتا ہے تب بھی آج کے مسلمانوں کے لئے "نومسلم" کی اصطلاح استعمال کرنا یا تو جہالت ہے یا کمینہ پروری۔ جہالت کا گمان تو شری چھاگلا جیسے پڑھے لکھے مسٹر پر مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اغلب یہی ہے کہ اس اصطلاح کے ذریعہ وہ سارے ہی مسلمانوں کی تحقیر و تنقیص کر کے اپنا دل ٹھنڈا کرنا چاہتے ہیں۔ دل میں جب کسی کے بارے میں بغض اور بیر بھرا ہو تو اسے طنز و طعن کا نشانہ بنا کر تسکین محسوس کرنا قدرتی بات ہے۔

اب ایک اور پہلو لیجئے۔

ایک اخبار نے شری چھاگلا کے جو الفاظ نقل کئے ہیں ان میں یہ فقرہ بھی ہے:۔

"بھارت اور ہندو تہذیب کے خلاف بکواس کرنا درحقیقت اپنے باپ دادا اور بزرگوں کو بدنام کرنا اور انھیں گالی بکنا ہے۔"

ہمیں نہیں معلوم کہ بھٹو نے بھارت اور ہندو تہذیب کے خلاف کیا کیا کہا۔ کسی اخبار میں بھٹو کی معترض فیہ تقریر تفصیلاً نہیں مل سکی۔ کچھ ٹکڑے غیر مربوط اور مجمل طور پر مطالعہ میں آئے ہیں جن میں "کتے" والا فقرہ شامل ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اہلِ بھارت کے لئے "کتے" کا لفظ استعمال کرنا پرلے سرے کی بدتمیزی تھی جس کے لئے بھٹو کی مذمت خوب خوب کرنی چاہئے۔ یہ لفظ بول کر انھوں نے خود ہی اعلان کر دیا کہ جذبات کی شدت اور غصے کے ہیجان نے ان کی مت مار دی ہے۔ لیکن چھاگلا صاحب کا یہ الزام پھر بھی محتاج ثبوت ہی رہتا ہے کہ بھٹو نے ہندو تہذیب یا ہندو بزرگوں کی شان میں گالی بکی ہو۔ الفاظ یہ بیان کئے جاتے ہیں کہ:۔

"بھارتی کتے سکیورٹی کونسل سے نکل گئے ہیں۔
لیکن جموں و کشمیر سے نہیں نکلے۔"

ان الفاظ کا روئے سخن بدیہی طور پر بھارت کے حکمران گروہ کی طرف ہے۔ ہندو تہذیب و کلچر اور ہندو بزرگوں سے ان کا ادنیٰ ربط بھی نہیں۔ یہ درست کہ بھارت کی ہیئتِ حاکمہ کے خلاف بھی اس طرح کی بدزبانی لفنگا پن ہے اور کوئی جواز تہذیب کی شریعت سے اس کا نہیں نکالا جا سکتا لیکن بھٹو کی ذاتی بدکلامی کو ہندو مسلم مسئلہ بنا کر یہ شوشہ چھوڑنا کہ ایک مسلمان نے ہندو تہذیب اور بزرگوں کو گالی دیدی شرانگیز اور فتنہ خیز قسم کی نکتہ سنجی ہے۔ ایک ایسا مفہوم ہے جس کا قائل نے ارادہ نہیں کیا۔

مذکورہ الفاظ کے علاوہ بھی جو ٹکڑے بھٹو کی تقریر کے اُردو اخباروں میں ہمیں مل سکے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس میں ہندو مسلم سوال کو اس انداز میں ابھارا گیا ہو جس انداز میں چھاگلا صاحب نے اُبھارا ہے۔ بھٹو پر پاکستانیت سوار ہے اسلامیت نہیں۔ اس کا واضح ثبوت اس سے ملتا ہے کہ پریس کانفرنس میں انھوں نے ان بھارتی مسلمانوں کی تعریف کی جو پاکستان کے خلاف بھارت کی طرف سے لڑے ہیں اور صاف لفظوں میں کہا کہ:۔

"ان کا لڑنا حق بجانب تھا۔ انھیں بھارت کیلئے لڑنا چاہئے تھا۔" (پرتاپ ۷ نومبر ۶۵ء)

اگر بھٹو کے نزدیک یہ جنگ دو ملکوں کی نہیں دو مذہبوں کی ہوتی، دو تہذیبوں اور کلچروں کی ہوتی تو ایسی بات کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بھٹو کے علاوہ ایوب خاں یا کسی اور پاکستانی ذمہ دار کے بارے میں بھی آج تک ہم نے نہیں سنا کہ اس نے موجودہ جنگ کو کفر و اسلام کی جنگ کہا ہو۔ پھر آخر یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ شری چھاگلا بھٹو کی بدزبانی کا رخ اور زاویہ بدل کر ایسا زہریلا جواب عنایت فرما گئے ہیں جو برادرانِ وطن کے دل و دماغ میں یہ ہیجان پیدا کرنے کے لئے بالکل کافی ہے کہ "پاکستانی وزیر خارجہ" کی طرف سے نہیں بلکہ ایک "مسلمان وزیر خارجہ" کی طرف سے ہندو تہذیب و تمدن، ہندو آئیڈیالوجی اور ہندو اسلاف کی توہین کی گئی ہے۔ یہ تو شہ دینا ہوا پوری امتِ مسلمہ کے خلاف ہندو برادرانِ وطن کو۔ یہ تو عین جن سنگھی تکنک ہوئی بھارتی مسلمانوں کے خلاف اکثریت کو بھڑکانے کی۔ دوسروں کو تو شری چھاگلا قومی یک جہتی کا درس دیتے ہیں۔ لیکن خود اپنے دماغ کی اُن تراوشوں کو نہیں روک سکتے جو سراسر دو قومی نظریے کی آنچ سے تپ رہی ہیں۔

نفسیاتی اثرات و مضمرات سے گذر کر منطقی سطح پر آیئے تب بھی شری چھاگلا کا جواب کھرا نظر نہیں آتا۔ واقعہ اگر یوں ہی ہو کہ ہم مسلمانوں کے باپ دادا کسی نہ کسی پشت میں ہندو ہی رہے ہوں تب بھی ہم مسلمان کفر و شرک سے وابستہ تہذیب و کلچر کی برائی کرنے میں تکلف نہیں برتتے اور نہیں برت سکتے۔ ہمارا تو قرآن ہی ورق ورق پر کفر و شرک کی شدید مذمت کرتا ہے اور ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کے دیئے ہوئے تصورِ توحید، تصورِ اخلاق، تصورِ تہذیب سے ٹکرانے والے ہر تصور کو مذموم سمجھو، مذموم کہو اور مذموم ثابت کرو۔ ہمارے اسلاف نے ایسا ہی کیا۔ ان میں سے جن کا سگا باپ بھی کافر و مشرک تھا اس تک نے کفر و شرک سے پناہ مانگنے اور مراسمِ شرک سے بیزاری ظاہر کرنے میں تأمل و توقف سے کام نہیں لیا حالانکہ اس کی زد اس کے دادوں پردادوں ہی پر نہیں اس کے سگے باپ تک پر پڑتی تھی۔ اس نے بہت صفائی سے اقرار و اعلان کیا کہ جن غیر اسلامی عقائد اور اندازِ فکر اور مشرکانہ آداب و اطوار پر اس کے باپ دادا نے زندگی گذاری ہے وہ لغو و باطل ہیں۔ واہی اور بے اصل ہیں معیوب و مذموم ہیں۔

اس طرزِ عمل کو جو شخص باپ دادوں کے لئے گالی قرار دیتا ہے وہ یا تو کند ذہنی کا ثبوت دیتا ہے یا عیاری کا۔ یہ طرزِ عمل در اصل ڈاکٹروں جیسا طرزِ عمل ہے جو امراض کے دشمن ہوتے ہیں مریضوں کے نہیں۔ ڈاکٹر ہر حال میں کینسر اور تپ دق اور جذام کی برائی کرے گا چاہے ان امراض میں اس کے باپ دادا ہی مبتلا رہے ہوں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جب وہ ان امراض کی بُرائی کرتا ہے، انھیں بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش میں سر کھپاتا ہے اور انھیں نشو و نما دینے والے اسباب سے دور بھاگنے کا وعظ دیتا ہے تو وہ گویا ان امراض کے شکاروں سے دشمنی کر رہا ہوتا ہے۔

اسلام نے ہمیں کافروں سے نہیں کفر سے، مشرکوں سے نہیں شرک سے نفرت سکھائی ہے۔ اسی لئے سچے اور پکے مسلمانوں کی تاریخ یہ ہے کہ انھوں نے کبھی کفار و مشرکین کی ذاتی تحقیر نہیں کی۔ انھیں گالی نہیں دی۔ انھیں نیچ اور اچھوت نہیں سمجھا۔ سچے اور پکے مسلمانوں کی بات تو الگ رہی۔ پاکستان کے مسلمان تو بہت ہی گئے گذرے ہیں۔ انھیں بھارت سے دشمنی بھی ہے اور بھارتی اربابِ حل و عقد کے دعوے کے مطابق پاکستان کی بنیاد ہی نفرت پر ہے۔ اس کے باوجود کوئی نہیں دکھلا سکتا کہ وہاں کے اخباروں اور کتابوں میں گذشتہ اٹھارہ سالوں میں کبھی بھی ہندوؤں یا سکھوں کے کسی بزرگ پر ذاتی حملے کئے گئے ہوں۔ اس کا نام توہین کے ساتھ لیا گیا ہو۔ اس سے عقیدت رکھنے والی امت کا دل دُکھایا گیا ہو۔ حالانکہ بھارت میں بھی اور امریکہ و انگلستان میں بھی نہ صرف

مسلمان بادشاہوں پر بلکہ مسلمانوں کے آقا سلطانِ دوسرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر بارہا ڈنکے کی چوٹ ذاتی حملے کئے گئے ہیں۔ مسلمانوں کی عین فطرت ہی اگر یہ نہ ہوتی کہ تمام مذاہب کے بزرگوں کا احترام کرو تو کونسا خوف پاکستانیوں کو اس سے باز رکھ سکتا تھا کہ اقدامی طور پر نہ سہی جوابی طور پر ہی سہی وہ خاتم الانبیاءؐ کی اہانت کا بدلہ خدا نخواستہ رام یا کرشن یا عیسیٰؑ یا عزیرؑ کی توہین کر کے لیتے۔ یہ سب تو بڑی ہستیاں ہیں پاکستانی مسلمانوں نے کبھی مذہبی رخ سے گاندھی جی تک کی اہانت نہیں کی۔ کر بھی کیسے سکتے تھے مسلمانوں کو گھٹی میں گھول کر یہ سبق پلایا گیا ہے کہ تمھارا مشن دل آزاری نہیں۔ گالی بازی نہیں۔ منافرت نہیں۔ بیماریوں سے جنگ کرو مگر اس طرح کہ یہ جنگ بیماروں کے خلاف جنگ نہ بن جائے۔ کفر و شرک کو مٹانے کی سعی و جہد کرو مگر اس طرح کہ جبر و تشدد نہ ہو۔ غنڈہ گردی نہ ہو۔ گراوٹ اور سفلہ پن نہ ہو۔

ہم نہیں کہتے کہ پاکستان نے اپنی اٹھارہ سالہ زندگی میں ایسے ہی معیاری اسلام کا نمونہ پیش کیا ہو۔ وہاں حقیقی اسلام کی حکومت ہے کہاں۔ وہاں حکومتی دائرے میں اسلام کو قائد و رہنما مانتا کون مسخرا ہے — پھر بھی زیر بحث موضوع کی حد تک — یعنی دوسروں کے اجداد و اسلاف کو گالیاں دینے نہ دینے کے باب میں وہاں کے پریس، ریڈیو، اسٹیج اور صحافت کا جو کردار رہا ہے اس سے ہمیں اس لئے واقفیت ہے کہ تجلّی کے تبادلے میں ہمارے پاس بہت اخبار رسالے آتے رہے ہیں۔ ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کے مسلمانوں نے کسی قوم کے بزرگوں اور باپ دادوں کو گالیاں دینے کا وہ گھناؤنا فعل کبھی نہیں کیا جسے شری چھاگلا غلط طور پر بھٹو کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ بھٹو نے بجز اس کی ہے سارے بھارتیوں کے خلاف اور بھارتی جس طرح ہندو ہیں اسی طرح سکھ، عیسائی اور مسلمان بھی ہیں۔ بے لاگ تجزیہ کرو تو بھٹو کی تبرا بازی کا نشانہ حقیقت میں بھارت کا اقتدار ہے جس میں صدارت اگر رادھا کرشنن صاحب کی ہے تو نیابت ذاکر حسین صاحب کی — اور سلامتی کونسل میں بھارت کے مستقل نمائندے اگر ہندو ہیں تو وزیر خارجہ سکھ ہیں اور میر قاسم صاحب مسلمان تھے جو سلامتی کونسل کو خطاب کر کے آئے۔

عمومیت اختیار کرو تو نشانہ سارا بھارت ہے۔ بھارت ہندوؤں کی طرح ہمارا بھی ہے۔ بھارتی کتّے تو ہم بھی کتّے۔ اور جب بھٹو یہ بجز اس کرتے ہیں کہ بھارتی کتّے کشمیر سے نہیں نکلے تو اس کا نشانہ وہاں کے ہندو حکام ہی نہیں جناب صادق اور میر قاسم صاحبان بھی یکساں طور پر بنتے ہیں۔ پھر یہ کیا کہ شری چھاگلا صاحب بھٹو کی یاوہ گوئی کو اس کی اصل سمت سے ہٹا کر خالص فرقہ وارانہ رنگ میں ابھار گئے اور جب ریڈیو نے ان کے ارشادِ گرامی کو چٹخارے کے ساتھ بیان کیا تو ہم نے خود دیکھا کہ ہمارے قریب بیٹھے ہوئے چند ہندو بھائیوں کے دل و دماغ میں "پاک و بھارت" سوال کے عوض "ہندو مسلم" سوال ابھر آیا جس کا اظہار ان کے ریمارک سے ہوا۔ ہم خود بھی شرمندہ سے ہوئے۔ کیونکہ نہ ہوتے۔ دنیا میں کہیں بھی کسی مسلمان پر اس کے مسلمان ہونے کی حیثیت سے کوئی الزام آتا ہے تو اسکی چوٹ خود ہماری اسلامیت پر بھی پڑتی ہے۔ ایک پاکستانی کی یاوہ گوئی کو جب شری چھاگلا نے ایک مسلمان کی یاوہ گوئی میں بدل دیا تو پاس بیٹھے ہوئے ہندو بھائیوں کے تأثرات سے ہمارا شرمسار ہو جانا قدرتی تھا۔ حالاں کہ شری چھاگلا کا جوابی حاشیہ ساتھ نہ ہوتا تو بھٹو کی بدکلامی پر نہ ہمیں شرمندگی کی ضرورت تھی نہ آنکھ چرانے کی۔ ان کی مذمت ہم یکساں جذبے اور جوش کے ساتھ کرتے کیونکہ لڑائی ہماری مسلمانوں سے نہیں پاکستانیوں سے ہے مسلمان بھٹو سے نہیں وزیر خارجہ آف پاکستان سے ہے۔

چھاگلا صاحب — اور اس ملک کے تمام اہل قلم خوب سمجھ لیں کہ جس جنگ کو "اسلام اور کفر" کی جنگ باور کرا دیا گیا اس جنگ میں کفر کو عامۃ المسلمین کی وہ حمایت

کبھی حاصل نہ ہو سکے گی جو پاک و بھارت کی موجودہ جنگ میں بھارت کو حاصل رہی ہے اور برابر حاصل رہے گی شاید اسی حقیقت کو سمجھتے ہوئے ہمارے بڑے بڑے لیڈروں نے متعدد بار اس پہلو کو واضح کیا ہے کہ یہ جنگ دو ملکوں کی جنگ ہے، دو مذہبوں کی نہیں۔ ہتری چھاگلا اور دیگر اہل مناصب کو ہمیشہ ایسے قول و فعل سے احتراز کرنا چاہیئے جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکے کہ "ہند و پاک" سوال "ہندو مسلم" سوال ہے۔ عامر عثمانی

بہشتی زیور۔ مکمل مدلل — ہر قسم کے شرعی مسائل پر مشتمل اس کتاب کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ اسے گھریلو مفتی تصور فرمائیے، ماؤں بہنوں، بیٹیوں کے لئے خاص چیز۔ قیمت بارہ روپے (مجلد ۱۵ روپے)

معراج المومنین — قرآن و حدیث کی روشنی میں نماز کے معارف اور روحانی بصائر کا مفصل مجموعہ۔ دو روپے

روح تصوف — صحابہ، علماء اور مشائخ و صوفیاء کے ارشادات کی روشنی میں تصوف کے جواہر اور حقیقت کی نشاندہی دلچسپ اور فکر انگیز۔ مجلد تین روپے چھپن

بے مثال زندگی — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر لیکن جامع سیرت جدید اسلوب میں حافظ امام الدین رام نگری کے شگفتہ اور رواں قلم سے۔ ۶۵ پیسے

شریعت و طریقت — مولانا اشرف علیؒ کی ایک مشہور کتاب جو آیات و احادیث کی روشنی میں شریعت اور طریقت کے باہمی ربط پر بڑی تفصیل سے بحث کرتی ہے ۵۴۲ صفحات۔ مجلد سات روپے۔

حصن حصین — شب و روز کے تمام معمولات اور زندگی کے ہر شعبے سے متعلق حدیث سے منقول دعاؤں کا مشہور مجموعہ۔ عربی مع اردو ترجمہ۔ قیمت دس روپے۔

خطبات مدراس — سیرت کے موضوع پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے شہرہ آفاق خطبات اپنی نوع کی واحد چیز۔ ساڑھے تین روپے۔

مجموعہ سیرت رسولؐ — حضورؐ کی حیاتِ مبارکہ کے تفصیلی حالات عام فہم زبان میں۔ بچے بچیاں اور غریب بھی فائدہ اٹھا سکیں اس لئے کتاب ۲۵ حصوں میں بانٹ دی گئی ہے۔ فی حصہ چالیس پیسے (سب حصے یکجا منگانے پر نو روپے)

کیا ہم مسلمان ہیں؟ — شمس نوید عثمانی کے پُرسوز مضامین کا مجموعہ۔ قیمت دو روپے پچیس ۲۵ نئے پیسے

سوانح حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ — تحقیقی انداز میں لکھی ہوئی بابا فرید گنج شکرؒ کی مفصل سوانح۔ مجلد چھ روپے۔

آداب زیارت قبور — زیارت قبور پر ایک عمدہ شہ پارہ۔ حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کے فرمودات۔ چالیس پیسے۔

پیام وطن کا آزاد نمبر — مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رنگا رنگ شخصیت پر دلچسپ مواد۔ ان کے نظریات، ان کے ادب اور ان کی دیگر خصوصیات پر نوع بہ نوع مقالے۔ قیمت تین روپے۔

فضائل صحابہؓ و اہل بیتؓ — حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے بعض نادر رسائل کا اردو ترجمہ۔ شاہ صاحبؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے مکتوبات بھی شامل کتاب ہیں۔ قیمت مجلد چھ روپے

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ — اپنے موضوع کی ایک معلومات افزا کتاب۔ دلچسپ اور مفید۔ قیمت دو روپے ۷۵ پیسے۔

فیوض یزدانی — شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کی الفتح الربانی کا اردو ترجمہ۔ پڑھنے، لطف لینے اور فائدہ اٹھانے کی چیز ہے۔ بارہ روپے۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

کتب احادیث

بخاری شریف اُردو مع عربی مکمل در تین جلد -/۴۵
مشکوٰۃ شریف " " " " " -/۲۸
مسلم شریف " " " " " -/۴۸
ابوداؤد شریف " " " " " -/۳۶
نسائی شریف " " " " " -/۳۰
مشکوٰۃ شریف صرف اُردو مکمل مجلد در دو جلد -/۱۸
سنن دارمی شریف " " دریک جلد -/۱۰
زبدۃ البخاری اُردو مع عربی (۱۵۲۴ قولی احادیث کا انتخاب) -/۱۳
مسند امام اعظمؒ (امام ابوحنیفہؒ کی انتخاب کردہ احادیث) -/۸
بلوغ المرام اُردو مع عربی -/۸
تجرید بخاری " -/۱۰
انتخاب صحاح " " -/۵

اسعد گیلانی کی چند کتابیں

قافلۂ سخت جان۔ اعلیٰ ایڈیشن چھ روپے۔ قسم دوم چار روپے۔
حکایاتِ جنوں دو روپے
تلاش راہِ حق ایک روپیہ ۵۰ پیسے
پکار ایک روپیہ ۵۰ پیسے

دینی تقریریں اسلام کی اہم ترین بنیادی تعلیمات پر مؤثر اور قیمتی تقریریں۔ ہر مسلمان کے کام آنے والی ضروری معلومات کے علاوہ یہ کتاب وعظ و تقریر کی مشق کے لئے بھی نہایت مفید ہے۔ دو روپے
(مجلد دو روپے ۷۵ پیسے)

سفر مصر و حجاز مولانا منت اللہ رحمانی کا ایک دلچسپ سفرنامہ جو حقیقت پسندانہ مطالعہ کا اچھا نمونہ ہے۔ قابل دید مقامات کی تصویروں کے ساتھ۔ دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

کوزے میں دریا

مولانا حامد علی کی چند اعلیٰ کتابیں جو اپنے اختصار میں جامعیت اور بلاغت کا کمال رکھتی ہیں۔ ہر کتاب اپنے موضوع پر محققانہ اور فکرانگیز دلائل اور معلومات کا خزانہ۔

شرک کے اثرات انسانی زندگی پر ۴۰ نئے پیسے
شرک۔ عظیم ترین گمراہی ۳۵ " "
کیا خدا کی ضرورت نہیں؟ ۴۰ " "
خدا پرستی ملحدین کی نظر میں ۴۰ " "
خدا ہے! ۴۰ " "
خدا کا انکار کیوں؟ ۴۰ " "
توحید اور عہد نامۂ عتیق ۴۰ " "
ہمارا دفاعی منصوبہ ۴۰ " "
ہندومت اور توحید ۸۰ " "
بُدھ مت اور شرک ۴۰ " "
ملحدین کے شبہات ۴۰ " "

کشکول مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے مختلف مضامین کا دلچسپ مفید اور ایمان پرور مجموعہ۔ گوناگوں معارف و لطائف۔ ساڑھے سات روپے۔

مفردات القرآن قرآنی الفاظ کی شرح و توضیح پر امام راغبؒ کی وہ شہرۂ آفاق کتاب جو تمام بڑی بڑی تفاسیر کے لئے بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔ اُردو ترجمے کے ساتھ۔ ہدیہ چالیس روپے۔

الوسیلہ قرآن میں جس وسیلے کا حکم دیا گیا ہے وہ کیا ہے؟ امام ابن تیمیہؒ کی یہ کتاب اپنے موضوع پر حرفِ آخر سمجھی گئی ہے۔ اُردو ترجمہ سلیس۔ قیمت نو روپے۔

چہرے شورش کاشمیری کے پُرکار قلم سے مشاہیر کا تعارف حسین اور بھرپور الفاظ میں۔ سیکڑوں قلمی تصویریں۔ قیمت پانچ روپے۔

مکتبہ تجلّی۔ دیوبند (یوپی)

از :- عبد الخالق سہارنپوری

جمعیۃ علماءِ ہند کا ماضی اور حال

جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲/۳ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ جمعیۃ العلماء کا کوئی ممبر اب سے مسلم مجلس مشاورت اور ان میں شریک جماعتوں کا ممبر نہ رہ سکے گا۔

جمعیۃ کے اس فیصلے پر ہر طرف سے تعجب و تأسف کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ "قومی آواز" لکھنؤ کے سوا جو روزِ اوّل سے ہی اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مسلم مجلس مشاورت کا شیرازہ منتشر ہو جائے، میرے علم کی حد تک کسی اخبار یا کسی معروف شخصیت نے تادمِ تحریر اس فیصلے کو مستحسن قرار نہیں دیا ہے۔ رہا قومی آواز کا معاملہ تو کون نہیں جانتا کہ معاصر قومی آواز کسی بھی مسلم تنظیم سے خوش نہیں ہے کیونکہ موجودہ ہندوستان میں کوئی مسلم تنظیم ایسی نہیں ہے جس پر فرقہ واریت کا لیبل نہ لگایا جا چکا ہو اور آئندہ بھی کوئی مسلم تنظیم ایسی نہیں ہو سکتی جو اس لیبل سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ معاصر قومی آواز کے نزدیک جس مسلم جماعت یا تنظیم پر کسی طرف سے فرقہ واریت کا لیبل لگ گیا بس اس جماعت کے ملک و ملّت کے لئے مہلک ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ جمعیۃ علماء ہند جمہوری کنونشن کرنے اور مسلم مجلس مشاورت سے آنکھیں بچانے کے باوجود فرقہ واریت کے لیبل سے نہ بچ سکی اور اب معاصر قومی آواز کی خواہش اور مرضی کے عین مطابق اس لیبل کو اُتار پھینکنے کے لئے مسلم مجلس مشاورت سے علیحدگی کا فیصلہ کر لینے کے باوجود معاصر قومی آواز کی مار سے بچ نہ سکی اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ اس وقت تک نہ بچ سکے گی جب تک کہ وہ ایسا ہی ایک اور "جرأتمندانہ قدم" نہ اٹھا دے جس کے نتیجے میں جمعیۃ کانگریس کا ضمیمہ بن کر رہنے کی بجائے پوری طرح کانگریس میں ضم ہو جائے

جمعیۃ کی صحیح تصویر

چنانچہ قومی آواز" کے جس اداریہ کی آخری ۳/۴ حصہ کو الجمعیۃ نے اپنے اس فیصلے کی حمایت میں نقل کیا ہے اس اداریہ کی ابتدائی ۱/۴ حصہ میں جسے الجمعیۃ نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا ہے خاصا عبرت آموز مواد موجود ہے۔

معاصر موصوف رقمطراز ہے:-

"حد ہو گئی کہ جمعیۃ نے اپنے سابق ورکنگ صدر پر باقاعدہ الزام لگانا شروع کر دیا ہے۔ الزام کے لئے جن باتوں کو لیا ہے ان میں قطعی اتنی جان نہیں ہے کہ اس پر کسی سنگین الزام کا بوجھ ڈالا جا سکے ----- اگر رسہ کشی اس حد تک گر گئی تو پھر سمجھ لیجئے کہ جمعیۃ کی عوام پسندی کا خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ ملکی معاملوں میں مسلمانوں کی کوئی خاص رہبری عرصے سے نہیں کر رہی ہے جو کام کرتی ہے وہ ہے احتجاجی بیانات اور مذہبی تعلیم۔ دوسری طرف جمعیۃ کا اخبار بھی صحیح راہوں پر نہیں جا رہا ہے۔ ان دونوں باتوں پر پچھلی مقبولیت کو برقرار رکھنا ہی مشکل تھا اور اب جو صورتِ حال پیدا ہو رہی ہے وہ تو ایسی ہے جو رہی سہی مقبولیت کو بھی ختم

کر سکتی ہے۔"

معاصر قومی آواز نے اپنے اس اداریئے کے اندر جمعیۃ کی جو تصویر پیش کی ہے اگرچہ وہ سو فی صدی درست ہے مگر جو لوگ معاصر موصوف کے مسلم جماعتوں کے سلسلے میں نقطۂ نظر سے واقف ہیں وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ معاصر نے یہ صحیح بات صرف اس لئے سپردِ قلم کی ہے کہ آخر جمعیۃ علماء بھی تو ایک ایسی ہی تنظیم ہے جس میں غیر مسلمین کی شرکت ممنوع ہے پھر بھلا یہ کس طرح ایک صحت مند تنظیم باقی رہ سکتی ہے؟

علیحدگی کا فیصلہ ایک عظیم سانحہ

بہرصورت جمعیۃ کا یہ فیصلہ ہم عقیدت مندانِ جمعیۃ کے لئے بھی ایک عظیم سانحہ ہے مگر حیرت واستعجاب کا باعث ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ جمعیۃ آج جس صورتِ حال سے دوچار ہے اس میں اس سے اس کے سوا اور توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی کہ یہ بہت جلد اس سانحہ سے دوچار ہوگی۔ البتہ تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ اربابِ جمعیۃ نے مجلس سے علیحدگی کے وہ اسباب ظاہر نہیں کئے جو فی الحقیقت ہیں اس کے برعکس ان کی طرف سے ایسی باتیں کہی گئی ہیں جن سے ہر غیرت مند جمعیتی کا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔

موہوم اندیشے

مثلاً ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل جس وقت عمل میں لائی گئی تھی اس وقت اربابِ جمعیۃ نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں آگے چل کر یہ ایک مستقل تنظیم نہ بن جائے مگر ان کے اندیشے کے جواب میں صدر مجلس نے اطمینان دلایا تھا کہ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔

قطع نظر اس کے کہ صدر مجلس نے اس طرح کی کوئی یقین دہانی نہیں کرائی تھی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اربابِ جمعیۃ کے لئے اس میں اندیشے کی کیا بات تھی مسلم مجلس مشاورت کے مستقل تنظیم بن جانے پر انھیں خطرہ کیا لاحق ہو جاتا؟ اور مسلمانوں کے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کو ہوا میں معلق رکھنے سے ان کا منشاء کیا تھا؟ یہ اُس وقت تو بلاشبہ ایک راز تھا مگر اب اس کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔ اسے آئندہ سطور سے بآسانی سمجھا جا سکے گا۔

جماعت اسلامی کا معجزہ

دوسری بات یہ کہی گئی کہ مجلس پر ان جماعتوں کا غلبہ ہے جن کا طریقۂ فکر اور نظامِ عمل جمعیۃ کے طریقۂ فکر اور نظامِ عمل سے بالکل جدا ہے اور یہ کہ اسی غلبہ نے مجلس کو گمراہ کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں یہ خوش گمانی تھی کہ مجلس مشاورت کے اندر چونکہ جمعیۃ کی "حریف" صرف دو جماعتوں کے فقط دو اور دو چار افراد ہیں باقی سات جمعیۃ کے اور چار کانگریس کے، ان گیارہ کے علاوہ بھی جو ارکان مجلس کے اندر ہیں وہ یا تو جمعیۃ کے حامی ہیں یا کم از کم اربابِ جمعیۃ کو ان سے کسی قسم کی شکایت نہ ہوگی۔ اس لحاظ سے مجلس مشاورت بہرصورت اربابِ جمعیۃ ہی کے زیر اثر ہوگی۔ مگر ہم پر آج یہ انکشاف ہوا کہ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے دو اور دو چار ارکان نے پوری مجلس کو "اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنا لیا ہے" اور بالآخر اربابِ جمعیۃ کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ "اب سے جمعیۃ العلماء کا کوئی رکن مسلم مجلس مشاورت کا رکن نہیں رہ سکتا" یہاں یہ سوال بار بار ذہنوں میں اُٹھتا ہے کہ آخر جماعت اسلامی کے اندر وہ کونسی طاقت ہے جسے استعمال کر کے اس کے صرف دو ارکان نے پوری مجلس مشاورت پر اپنا قبضہ جما لیا ہے؟

جمعیۃ کا حسین نعرہ

حقیقت تو یہ ہے کہ اس امر میں جماعت اسلامی یا مسلم لیگ کی کسی معجزانہ طاقت کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ جمعیۃ کو اس شرمناک فیصلہ پر اس کے اس زعم نے مجبور کر دیا کہ — "مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت جمعیۃ علماء ہند ہے" اس معاملے میں وہ خود کو وحدہٗ لاشریک تصور کرتی ہے

اسے اچھی طرح اس بات کا یقین ہو گیا کہ مسلم مجلس مشاورت نے بہت ہی مختصر مدت کے اندر مسلمانوں کے تقریباً تمام طبقوں سے زبردست اعتماد حاصل کر لیا ہے اور اب وہ مسلمانانِ ہند کی ایک قابل اعتماد قیادت کی شکل میں اُبھر رہی ہے۔ ارکانِ مجلس مطمئن ہیں کہ مجلس کی ترقی ملک کی اور ملک کے جملہ مسلمانوں اور مسلم تنظیموں کی ترقی ہے۔ کیونکہ اسے ہر ایک مسلمان اور مسلم جماعت کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ اگر کبھی کسی نے دبی زبان سے یہ سوال کیا کہ مجلس مشاورت کا ماضی کیا ہے۔ اسکی تاریخ کتنی ہے اس کی ملکی و ملّی خدمات کی فہرست کہاں ہے؟ تو ارکانِ مجلس کے اتحاد نے منھ توڑ جواب دیا ہے کہ اس مجلس کا ماضی جسے دیکھنا ہو وہ مجلس کے اندر شریک شخصیتوں اور تنظیموں کا ماضی دیکھ لے وہیں اسے ملکی و ملّی خدمات کی ایک طویل فہرست بھی ملے گی اور وہ سب کچھ مل جائے گا جسکی ضرورت آج محسوس کی جائے گی۔

مجلس جمعیۃ کیلئے خطرے کا الارم

مگر افسوس کہ مسلمانوں کی اس قابلِ اعتماد مجلس اور صحت مند قیادت کو اربابِ جمعیۃ نے اپنی موہوم "واحد نمائندگی" کے لئے خطرے کا ایک الارم تصور کیا اور اپنے تئیں مجلس کو ڈائنامیٹ کر ڈالنے کے لئے اس نازک ترین وقت میں ایک ایسا اقدام کیا جس کے ملتِ اسلامیہ کا کوئی بھی خیرخواہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جمعیۃ کی ناکامی

اربابِ جمعیۃ کے اس عجلت پسندانہ اور غیر دانشمندانہ اقدام سے مسلم مجلس مشاورت پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اب یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جمعیۃ مسلم مجلس مشاورت کو تہس نہس کر دینے والی اسکیم میں بُری طرح ناکام ہو گئی ہے اور جمعیۃ کی ان قابل اعتماد شخصیتوں نے جو مجلس کی روح رواں ہیں مجلس عاملہ کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اگرچہ اربابِ جمعیۃ کی طرف سے انھیں اپنی اس جرأت مندی اور حق پسندی کے "جرم" کا ابھی سے خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔

اربابِ جمعیۃ کو بجا طور پر یہ اندیشہ تھا کہ اگر مسلم مجلس مشاورت کو کچھ دنوں تک اور آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع مل گیا تو اربابِ جمعیۃ کی نام نہاد "نمائندہ قیادت" کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا اور ملکی و ملّی مسائل کے اندر کچھ ایسے لوگ بھی نظر آنے لگیں گے جو اپنی خداداد صلاحیتوں اور قابلیتوں سے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں شانہ بشانہ سرگرم عمل ہوں گے یہ خوش کن صورت حال اربابِ جمعیۃ کی نام نہاد "واحد نمائندگی" کے لئے ایک عظیم سانحہ تھی۔ حالانکہ مجلس مشاورت کی کامیابی درحقیقت خود جمعیۃ علماء ہند کی کامیابی تھی مگر یہ کامیابی اربابِ جمعیۃ کو صرف اس لئے منظور نہ ہوئی کہ اس میں دیگر جماعتوں اور شخصیتوں کا بھی حصّہ ہوتا جب کہ جمعیۃ کے نزدیک یہ ایک "شرک عظیم" ہے۔ جسے وہ کسی طرح بھی انگیز نہ کر سکتی تھی۔

اب آئیے ہم جمعیۃ کی واحد نمائندگی اور اس کے شاندار ماضی کا بھی جائزہ لیتے ہیں چونکہ اربابِ جمعیۃ اپنے شاندار ماضی کی بنیاد پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی واحد نمائندگی اور قیادت کا حق صرف انھی کو پہنچتا ہے' اس لئے سب سے پہلے ہم اس کے ماضی پر ہی گفتگو کریں گے۔

ہمیں ایک لمحہ کے لئے بھی اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تأمل نہیں ہے کہ ہمارے بزرگوں اور ہماری عظیم شخصیتوں نے دین و ملت کی خدمات اور ملک کو انگریزوں کے پنجۂ جبر و استبداد سے نجات دلانے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دی تھی۔ انھوں نے حق کی خاطر عظیم ایثار و قربانی کی جو مثال قائم کی ہے اس میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے بے شک انھوں نے جمعیۃ العلماء کو ایک عظیم نصب العین ایک واضح مقصد اور باوقار طریقۂ عمل سے آراستہ کیا تھا ان کی جمعیۃ علماء ہند فی الحقیقت جملہ مسلمانوں کی ایک قابل اعتماد قیادت کی متحمل تھی۔ مگر ۴۷ء کے بعد کی جمعیۃ العلماء نے اُس نصب العین اور مقصد سے جان بوجھ کر

انحراف کیا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل کی جمعیۃ العلماء دین اسلام کی داعی اور علمبردار تھی مسلمانانِ ہند کی ان کی زندگی کے تمام گوشوں میں قرآن حکیم اور سنتِ رسول کی روشنی میں رہنمائی کرتی تھی اس کا نصب العین اقامتِ دین تھا ان کی جملہ سعی و جہد کا واحد مقصود بھارت کی اندر دین اسلام کا غلبہ و نفاذ تھا میدان سیاست ان کے لئے ممنوعہ علاقہ نہ تھا۔ غیر دیندار شخصیتوں کے لئے ان کی صفِ قیادت میں کوئی جگہ نہ تھی۔ مگر ۱۹۴۷ء کے بعد جمعیۃ العلماء اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے تو وہی رہی مگر ایک جسم بے روح کے مثل، بے شک آج بھی اس کی سرپرستی ان بزرگوں کے صاحبزادے ہی کر رہے ہیں مگر ان کے نصب العین اور مقصد کو ترک کر کے آج بھی ارباب جمعیۃ مسلمانوں کی واحد نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں مگر قرآن حکیم اور سنتِ رسولؐ کی روشنی میں نہیں بلکہ سیکولرازم کی روشنی میں اُس وقت جمعیۃ علماء ہند اور اس کے قیام کا مقصد درج ذیل تھا:۔

"مسلمانوں کے لئے ایک دینی نظم قائم کرنے کی غرض سے اولاً علماء کی تنظیم کا فیصلہ کیا گیا جو جمعیۃ علماء ہند کی شکل میں بفضلہ تعالیٰ مسلمانانِ ہند کے سامنے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دینی نظم وہی ہو سکتا ہے جو وارثانِ انبیاء علیہم السلام کی زیر قیادت ہو جن کو شریعت غراء کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔"

اس وقت جمعیۃ العلماء کا مقصود یہ تھا:۔

"جمعیۃ العلماء نے جتنے کام کئے ہیں سب اسلامی تعلیمات کے ماتحت ہیں اور ان کاموں کا محور صرف ایک ہے یعنی یہ کہ کلمۃ اللہ سربلند ہو۔ اسلامی اصول و قوانین کا احترام قائم ہو۔۔۔ ۔۔۔جمعیۃ العلماء ہند جو کچھ آج تک کرتی رہی ہے اور آئندہ کرے گی وہ صرف ایک اہم دینی مقصد کے حصول کے لئے یعنی یہ کہ شرعی اصول کے ماتحت حتی الامکان اس ملک میں اقامتِ دین کا عظیم الشان مقصد پورا ہو اور ایک اہم ترین فریضہ اسلام ادا ہو کیونکہ جس طرح بحکم اقیموا الصلوٰۃ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تشریح کے بموجب اقامت صلوٰۃ فرض ہے ٹھیک اسی طرح ان اقیموا الدین کے ارشاد گرامی کے بموجب اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی توضیح و تفسیر کے بموجب اقامتِ دین فرض ہے اور یہ فرض اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب کہ اسلام کا وہ اجتماعی نظام صحیح طور پر قائم ہو اور اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ تمدنی و معاشرتی قوانین کا اجراء و نفاذ ہو۔ اور اس کا احترام ہر طرح بر قائم ہو جائے۔ دینِ حق میں جہاد فی سبیل اللہ کی مشروعیت اسی اہم مقصد کیلئے ہے اور لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا کا یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ یعنی احکام و قوانین تمام انسانوں کے احکام و قوانین سے بالاتر رہیں اور انہی کا اجراء و نفاذ ہو۔"

"اصل حقیقت یہ ہے کہ اقامتِ دین اور قوانینِ الٰہیہ کی سربلندی اور نظام اسلامی کے قیام کیلئے جس وقت اور جس زمانہ میں جو طریقہ کار بھی اختیار کیا جائے (بشرطیکہ وہ صریح نصوص اور اصول اسلامی کے خلاف نہ ہو) وہ حقیقۃً جہاد فی سبیل اللہ ہے۔"

آگے چل کر مزید ارشاد ہوتا ہے:۔

"جمعیۃ علماء ہند اقامتِ دین کی غرض سے جو طریقۂ عمل اور حکمتِ عملی اختیار کرتی ہے وہ جہاد فی سبیل اللہ کی ایک عملی شکل ہوتی ہے اور جو مسلمان جمعیۃ علماء ہند کی جدوجہد میں عملاً حصہ لیتا ہے وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے اور جو لوگ مال و زر سے

جمعیۃ علماء ہند کی اعانت وامداد کرتے ہیں وہ مجاہد فی سبیل اللہ کے شریک ومعاون ہیں — مسجدوں اور کنووں کا بنوانا، یتیموں کی دعوت وغیرہ بھی اگرچہ دین کے کام ہیں اور نہایت ضروری ہیں مگر انکی حیثیت فروعات کی ہے اسلامی اجتماعی زندگی کی اصل بنیاد یہ ہے کہ قوانین الٰہیہ کے اجراء و احترام کی سعی کی جائے — تمام اولوالعزم انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور صحابۂ عظام کی زندگیوں اور ان کی تعلیمات میں ان حقائق کو سمجھنے کے لئے کافی ذخیرہ موجود ہے — واقعہ یہ ہے کہ دین کے تمام فروعی کام صحیح طور پر اس وقت انجام پذیر ہو سکتے ہیں جب اسلامی نقطۂ نظر سے سیاسی اقتدار خدا پرستوں کے ہاتھ میں ہو تاکہ مخلوق خدا امن وراحت کی زندگی بسر کر سکے ملک میں امن وامان اور عدل وانصاف کا دور دورہ ہو۔"

"آج اسی ایک سیاسی قوت کے نہ ہونے سے مسلمانوں کا اجتماعی نظام درہم برہم ہے اسلامی قوانین کی بے حرمتی ہو رہی ہے مسلمانوں کے خاص معاشرتی احکام ونظام کو موجودہ قوانین پامال کر رہے ہیں غیر اسلامی طریقوں پر عموماً مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت ہو رہی ہے اور یہ اندیشہ بے جا نہیں ہے کہ اگر علماءِ حق نے اس ملک کی سیاسیات میں عملاً حصہ لیکر اسلامی نظام اجتماعی کے قیام وبقاء کی کوئی صورت نہیں نکالی اور اس ملک کے نظام حکومت اور قوانین ساز مجالس میں اسلامی تحفظ کی راہ نہیں پیدا کی تو خدانخواستہ ہمارے مدارس و مساجد اور خانقاہوں کی بڑی سے بڑی عمارتیں بھی بے کار پڑی رہیں گی کیونکہ لادینی اقتدار خواہ وہ نام کو مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہو وہ تمام مراسم اور شعائر اسلامی کو ایک ایک کر کے تباہ وبرباد کر دیگا دنیا کی تاریخ میں ایسے شواہد موجود ہیں کہ جب گمراہوں اور بے دینوں کے ہاتھ میں اقتدار آیا ہے تو انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا ہے۔"

"قرآن حکیم ایک مکمل قانون ہے عرش معلیٰ سے نازل فرمودہ انسانی خطا اور لغزش سے پاک، اس کا ہر حکم صحیح، ہر جملہ صحیح، ہر فقرہ صحیح، ہر حصے پر ایمان لانا فرض، ہر حکم پر عمل کرنا لازم، اس کے ہر نظریے کو تسلیم کرنا شرط ایمان، قانون حکومت کی طاقت چاہتا ہے — حکومت کے بغیر قانون ایک قالب ہے بے جان — جسم ہے بے روح — علماء ملت اس حقیقت کو پہچانتے ہیں ---- اس اہم نصب العین کی خاطر وہ جزئیات کی نہ پروا کرتے ہیں اور نہ شرعاً وعقلاً یہ جائز ہے کہ جزئیات کے لئے اصول کو قربان کر دیا جائے۔"

مندرجہ بالا طویل اقتباسات سے اگرچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جس ماضی کو آج کے اربابِ جمعیۃ شاندار ماضی کہتے ہیں اور جس کی دہائی دے کر وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند آج انھیں اپنا واحد نمائندہ تسلیم کر لیں اس ماضی میں جمعیۃ العلماء کا مقصد اور نصب العین اقامتِ دین تھا — حکومتِ الٰہیہ کا قیام تھا۔ اسلامی نظام کا غلبہ ونفاذ تھا۔ اور اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کا تصور یہ تھا کہ :-

"احکام شریعت کے بموجب نظامِ اجتماعی کے بغیر مسلمانوں کی زندگی گویا اسلام کے تخیل سے بھی خارج ہے۔"

لیجئے لگے ہاتھوں دو اور اقتباسات کا مطالعہ فرمائیے

"اسمبلیوں کی قانون سازی سے اگرچہ وہ فرض ادا نہیں ہوتا جو مسلم پر بحیثیت مسلم عائد ہوتا ہے کیوں کہ اسمبلی کا وضع کردہ قانون اگر کلیۃً شریعت کے مطابق ہو تب بھی وہ اسمبلی کا قانون ہوگا اور مسلمانوں پر فرض یہ ہے کہ وہ خود قرآن کو قانون کی حیثیت سے تسلیم کرے اور بحیثیت قانون اس کے احکام نافذ

کرائے۔ جب تک اِنِ الحُکمُ اِلّا للہ کے بموجب حکم اور قانون صرف اللہ کا نہیں مانا جائیگا مسلمان اپنے فرض سے سبکدوش نہ ہوگا۔"

" ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے جمعیۃ علماء ہند کے سامنے اوّل یوم سے جو سب سے اہم اور ضروری کام پیش نظر ہے وہ مسلمانوں کی اسلامی تنظیم اور نظام شرعی کا قیام ہے۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباسات کو بار بار پڑھیئے اور دیانتداری سے فیصلہ کیجئے کہ کیا آج کی جمعیۃ العلماء اس نصب العین اور مقصد کی حامل ہے جس کی حامل ۴۷ء سے قبل کی جمعیۃ تھی؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر آج کس بنیاد پر ارباب جمعیۃ مسلمانانِ ہند سے جمعیۃ علماء ہند کو ان کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرانے پر مصر ہیں؟ ٹھیک ہے کہ ۴۷ء سے قبل کی شخصیتوں نے جمعیۃ العلماء کو ایک پاکیزہ روح کے ساتھ قائم کیا تھا اور عرصہ دراز تک اپنے خون اور پسینے اور اپنی پُرخلوص صلاحیتوں سے اسے صحت مند رکھا اور مسلمانوں نے بجا طور پر اس پر اعتماد کیا مگر اب جبکہ موجودہ اربابِ جمعیۃ نے اس کے مقصد و نصب العین کو یکسر تحریف کرڈالا تو کیا مسلمانانِ ہند صرف اس بنا پر جمعیۃ العلماء کو واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرلیں کہ یہ استدعاً مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ کے صاحبزادے کررہے ہیں اور صاحبزادے کی بات صرف اس لئے تسلیم کرلی جائے کہ انھیں گھر سے نکلتے ہی خود جمعیۃ کے نادان دوستوں نے فدائے ملت کا خطاب دیدیا ہے؟

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ آج جمعیۃ کے مرکزی رہنما جماعت اسلامی پر اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کے آوازے کس کر اربابِ اقتدار کو ان کے خلاف بھڑکانے کی شرمناک کوششوں میں مصروف ہیں اور خود کو سیکولرازم کا سب سے بڑا علمبردار اور حکومتِ وقت کا حقیقی وفادار ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ مگر اس بات کے لئے بضد ہیں کہ مسلمان انھیں اپنا دینی رہنما اور جمعیۃ العلماء کو اپنی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کریں۔ ہمارے کہنے کا منشا یہ نہیں ہے کہ وہ سیکولرازم کو اپنا نصب العین نہ بنائیں۔ البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ وہ جمعیۃ کے شاندار ماضی کے پردے میں اپنے تاریک تر حال اور (خدانخواستہ) تاریک ترین مستقبل کو چھپانے کی کوشش نہ کریں اور اقامتِ دین کے ان علمبرداروں کے نام پر مسلمانوں کو لادینیت کے قعرِ مذلت میں دھکیلنے کی کوشش نہ کریں جو ۴۷ء سے قبل جمعیۃ کے سرپرست اور روح رواں تھے۔

تجلّی

ہمیں فاضل مضمون نگار کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ جمعیۃ علماء نے اپنی سمتِ سفر سن سینتالیس میں بدلی تھی اور اس کی قلب ماہیت کا پہلا سویرا خاورِ آزادی طلوع ہونے کے بعد ہوا تھا۔ ہمیں تو اس سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیۃ العلمائے ہند کے جو ایمان افروز اور ولولہ خیز اقتباسات ان کی کتاب سے نقل کئے گئے ہیں وہ بہت محدود ابتدائی زمانے کو چھوڑ کر کسی بھی وقت جمعیۃ کے مجموعی فکر اس کے تحریکی ذہن اور عملی اسکیم کا محور و مرکز رہے ہوں۔ یہ اقتباسات تو دراصل مولانا صاحب کے ذاتی جذبے اور خواہش اور میلانِ طبع کے حسین مظہر ہیں جو کسی طوفانی موج کی طرح گئے گذرے زمانے میں اٹھے تھے اور پھر ساحل کی ریت میں جذب ہوگئے۔

ویسے ان کی طاقت اور نمود "تحریک خلافت" کے پس منظر میں ضرور ہوئی تھی۔ مگر اس کا تعلق مولانا محمود الحسن شیخ الہند اور مولانا محمد علی جوہر اور حکیم اجمل خاں اور مولانا انور شاہ جیسے مردانِ مومن کے اپنے اپنے منفرد اور مصفّٰی قلب و ذہن

---

[1] جملہ اقتباسات مولانا محمد میاں صاحب کی تصنیف "جمعیۃ العلماء کیا ہے؟" حصہ اول سے لئے گئے ہیں مولانا موصوف اسوقت جمعیۃ کے ناظم تھے تقسیم ملک کے بعد مولوی اسعد میاں سے قبل ناظم رہے اور آج بھی موصوف جمعیۃ کے مشیر اور ترجمان ہیں ۱۲

سے تھا جسے جمعیۃ کے جماعتی ڈھانچے میں بس وہی مقام دیا جا سکتا ہے جو نو ساختہ مکان میں چونا قلعی اور رنگ روغن کو حاصل ہوتا ہے۔ اس مکان کی دیواریں جن اینٹوں سے بنی تھیں ان کا خمیر ان مقدس خیالات سے نہیں اٹھا تھا پھر یہ رنگ روغن ان مردانِ مومن کی موت سے اتر گیا اور مقدس خیالات کی معصوم روح جامد اور مجہول سیاست کے طلسم زار میں تحلیل ہوتی چلی گئی۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا محمد میاں جس وقت یہ بلند و برتر شاعری فرما رہے تھے ٹھیک اسی وقت جمعیۃ کی سرگرمیاں، سیاسی فکر اور خیالی نشانے ان خیالات کے عملی تقاضوں سے کوئی مضبوط، نتیجہ خیز اور شعوری رابطہ نہیں رکھتے تھے۔ اس دور میں ہم علماء کی فصیح و بلیغ تقریروں، تحریروں اور ایثار و قربانی کے آہنگ میں بس ایک ہی نغمہ سنتے ہیں ـــ "انگریزو! نکل جاؤ ـــ غلامی مردہ باد ـــ ہم آزادی چاہتے ہیں۔"

یہ نغمہ یقیناً بڑی جرأت و مردانگی سے گایا گیا ـــ تلواروں کی چھاؤں میں گایا گیا گولیوں کی زد اور پھانسی کے تختوں پر گایا گیا۔ مگر اس نغمہ ریزی میں علماء تنہا نہ تھے یہ تو پورے ملک کا کورس تھا اور مسلمانوں کی طرح برادرانِ وطن بھی اپنے خون سے چراغ جلانے کا کھیل بڑی ہمت سے کھیل رہے تھے۔ پھر کیا اس مشترکہ نغمے میں کوئی ایسا سُر بھی ملتا ہے جس سے عامۃ المسلمین کو یہ اطمینان ہو جاتا کہ آزادی کی جد و جہد میں ابنائے وطن سے اشتراک و اتحاد کے باوجود علمائے جمعیۃ کے ذہنوں میں مستقبل کے نظامِ حکومت و سیاست کے لئے کوئی ایسا مخصوص اور منفرد خاکہ بھی ہے جو ابنائے وطن کے ذہنی خاکوں سے مختلف ہو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ابنائے وطن حکومتِ الٰہیہ کی تاسیس اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے آزادی نہیں مانگ رہے تھے۔ ان کا مقصود اپنی پسند کی ایک غیر اسلامی حکومت بنانے کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر کیا سن سینتالیس سے پہلے جب پورا ملک مطلوبہ آزادی کا ترانہ گا رہا تھا علمائے جمعیۃ نے کوئی مصرعہ اس میں ایسا بھی شامل کیا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ کسی ایسی حکومت پر راضی نہ ہوں گے جس میں اسلام کا درجہ بس ایک یتیم کا ہو اور مسلمانوں کی حیثیت ان دریوزہ گروں کی سی ہو جن کے لیل و نہار حقوق کی بھیک مانگنے، ناانصافیوں پر واویلا کرنے، دستور کی دہائی دینے اور اپنی بے بسی پر ہاتھ پیر پیٹنے میں کٹتے ہیں۔

مولانا آزاد کے قلم کی گھن گرج کون بھول سکتا ہے ایمان و اسلام اور جہاد فی سبیل اللہ کے جو بے مثال لولو و مرجان ان کے خامۂ عنبر شمامہ نے بکھیرے ان کی چمک دمک تو آج بھی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے ـــ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ سیاست کا جو رُخ انھوں نے لیا اور جہادِ آزادی کے جس نقشے پر وہ چلے کیا اس میں اور ان کے خطبات و مواعظ میں کوئی منطقی اور تکنیکی ربط بھی تھا۔ کیا وہ جو کچھ کہتے آئے تھے، جو ان کے قلم کی دعوت تھی، جو زبان وہ بول رہے تھے جس لاہوتی منزل کی طرف ان کی شعلہ نوائیاں آواز دے رہی تھیں اس سے ان کی عملی اسکیم، حقیقی دوڑ دھوپ، سیاسی چال ڈھال اور نقشۂ جنگ کو بھی وہی مناسبت تھی جو ارادے اور عمل کے درمیان ہوتی ہے؟

تاریخ کا ہر ذہین طالب علم دیکھ سکتا ہے کہ کہا اور لکھا جو کچھ بھی گیا ہو مگر جنگِ آزادی علمائے جمعیۃ نے جس نقشے پر لڑی ہے وہ ٹھیک ٹھیک وہی تھا جس کے نتیجے میں حکومتِ الٰہیہ اور اقامتِ دین کا کوئی تصور تک پیدا نہیں ہو سکتا تھا اسی لئے انھیں نعرہ باز مسلم لیگ کے مقابلے میں شکستِ فاش اٹھانی پڑی۔ "نعرہ باز" کا لفظ محض طعن نہیں امرِ واقعہ ہے۔ وہ ایک نعرہ ہی تو تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ ـــ لا الٰہ الا اللہ! ـــ اور لطف یہ ہے کہ اس نعرے کا طلوع اُن فاسق و فاجر مسلمانوں کی زبان سے ہوا جن کا اسلام بظاہر ایک نسلی اسلام کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ جو صورت اور کردار ہر اعتبار سے انگریزوں کا سایہ تھے۔ جن سے ادنیٰ سا بھی حسن ظن مذہب پسند عامۃ المسلمین کو نہ تھا لیکن انھیں

جیت اسی لئے ہوئی کہ علمائے جمعیۃ کے قول وعمل کے تضاد نے سادہ لوح مسلمانوں کو تحیّر، جھلاّہٹ اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ انھیں مدّت سے جو خواب مولانا آزادؒ جیسے سحر طراز خطیب دکھلا رہے تھے وہ تو کچھ اور ہی تھے مگر جو عملی اسکیم اور نقشۂ کار ان کے سامنے آیا وہ ان حسین خوابوں سے یکسر مختلف تھا۔ اس تضاد کی ضرب ان کے دل ودماغ پر بھرپور پڑی اور بدگمانی ونفرت کے ایک نفسیاتی لمحے میں وہ تنکے کی طرح مسلم لیگ کے رُخ پر بہہ گئے یہ فریب خوردگی ضرور تھی مگر اس کا سہرا فی الحقیقت مسلم لیگیوں کے کمالِ فریب دہی کے سر نہ تھا بلکہ اُن علماء کے سر تھا جو زبان تو ابن تیمیہؒ اور مجدد الف ثانیؒ کی بولتے آئے تھے مگر عین مقابلے کے وقت وہ فقط یہ ثابت کرتے نظر آ رہے تھے کہ حکومتِ الٰہیہ اور اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ الحق اور جہاد فی سبیل اللہ جیسی تمام ارفع واعلیٰ اصطلاحوں کا واحد مصداق وہ سیکولر جمہوریت ہے جس میں کامل اقتدار غیر مسلم اکثریت کے ہاتھ میں ہو اور اسلام کو بس ایک محدود سماجی دائرے میں زندہ رہنے کی اجازت مل جائے۔

تمثیل کی زبان میں یوں سمجھئے کہ ایک گروہ زبان وقلم کی پوری طاقت مکھن کی تعریف میں صرف کر دیتا ہے اور تلقین کرتا ہے کہ دودھ سے مکھن نکالنے کا بہت بڑا کارخانہ قائم کرنے کے لئے اس کی برادری وسائل وذرائع اسے مہیا کرے، ہاتھ بٹائے، تن من دھن سے تعاون دے۔ برادری آمادہ ہو جاتی ہے۔ آگے بڑھ کر تعاون پیش کرتی ہے اور وقت آ جاتا ہے کہ داعی گروہ دودھ سے مکھن سے نکالنے کے کارخانے کا نقشہ بنائے۔

اب کیا حال ہوگا برادری کی جھلاّہٹ اور بیزاری کا اگر وہ یہ دیکھے کہ نقشہ ڈیری فارم کا نہیں تیل صاف کرنے کے کارخانے کا بن رہا ہے اور اسکیم مکھن نکالنے کی نہیں بلکہ پٹرول برآمد کرنے کی چل رہی ہے۔

ٹھیک اسی وقت کچھ لوگ اٹھتے ہیں جو پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اے برادری والو تمھیں دھوکا دیا گیا —— مکھن کا کارخانہ تو ہم بنانے جا رہے ہیں —— یہ دیکھو یہ دودھ ہے یہ ڈیری فارم کا نقشہ ہے۔ یہ کل پُرزے ہیں۔ بس زمین ملنے کی دیر ہے۔ وہ ملی اور ڈیری فارم تیار ہوا۔ قدرتی بات ہے کہ سطح بیں وسادہ لوح برادری والے ادھر دوڑیں گے۔ وہ پہلے گروہ کے پیدا کردہ اعصابی ہیجان میں اس قابل ہی نہیں رہے ہیں کہ چونا ملے ہوئے پانی اور دودھ میں فرق کر سکیں یا یہ سوچ سکیں کہ جو مسخرے زندگی بھر کوئلہ کھودتے آئے ہیں وہ دودھ سے مکھن نکالنے کا فن کیا جانیں گے۔

پاکستان کبھی نہ بنتا اگر جمعیۃ علمائے ہند سن سینتالیس سے قبل عامۃ المسلمین کو یہ باور کرا سکتی کہ وہ واقعتہً وہی ہے جس کا ناک نقشہ مولانا ابو الکلامؒ اور مولانا محمد میاں جیسے عمائد بیان کرتے چلے جا رہے ہیں۔ پاکستان بنا ہی اس لئے کہ تقدس مآب علماء کی پچھلی تحریروں اور تقریروں کو ان کے اپنے اقدام و عمل کی ٹھوکروں میں پاش پاش ہوتے دن کی روشنی میں دیکھا گیا۔ پھر حق یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا گیا وہی امرِ واقعہ بھی تھا۔ ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ مولانا آزادؒ کی وزارتِ تعلیمی کا سارا زمانہ ایک سناٹا، ایک سکوتِ مسلسل اور ایک جمودِ یاس بن کر گذرا۔ حالانکہ اگر ان کے سارے خطبات و مواعظ اور مقدس شہ پارے ان کے اپنے شعور کی زمین میں جڑیں رکھے ہوئے ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کے دورِ وزارت میں ایسی بہتیری کتابیں تعلیمی نصاب کا جزو بن جاتیں جن کے مضامین پکار پکار کر کہتے کہ اے الہلال والبلاغ کے عظیم ہیرو! آپ نے جو خواب اپنی قوم کو عرصۂ دراز تک دکھلائے تھے ان کی تعبیر ہم دے رہے ہیں! یہ دیکھئے آپ کے ایک خدا کے مقابلے میں درجنوں دیوتاؤں کا میلا! اور یہ دیکھئے اس میلے میں وہ ہزاروں نونہال ہاتھ جوڑ کر دیوتاؤں کے بھجن گا رہے ہیں جنھیں آپ جہادِ حق کا سپاہی بنانے کی باتیں کیا کرتے تھے۔!

ماضی کے بعد حال کی طرف آئیے۔ مولانا حفظ الرحمان طاب اللہ ثراہ بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے جو لمبی مدّت تک ایک ایسی گاڑی کھینچتے رہے جس کے پہیے زمین سے ایک بالشت اُوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے

حکومتِ الٰہیہ اور اقامتِ دین کی باتیں نہیں کیں بلکہ صاف صاف وہی کہا جو ایک حقیقت پسند کو کہنا چاہیئے تھا۔ انھوں نے شاعری نہیں کی۔ خواب نہیں دکھلائے۔ وہ عملی آدمی تھے اور اسی لئے انھوں نے جمعیۃ کے تنِ بے روح میں کسی مصنوعی روح کو داخل کرنے کی فضول کوشش کے عوض یہ پسند کیا کہ اپنی گوناگوں قابلیتوں اور اپنے ذہین و مخلص احباب کی اعانتوں سے اس تنِ بے روح کو حنوط کر کے گلنے سڑنے سے بچالے جائیں — اور بچالے گئے! — ناانصافی ہوگی اگر ان کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے۔ نیز یہ بھی اعتراف ضروری ہوگا کہ مولانا محمد میاں کی نظافت بھی جمعیۃ کے گرتے ہوئے ڈھانچے کے لئے خاصی مضبوط روک بنی رہی ہے۔

مگر اب نظامت ایک نوخیز "لیڈر" کے ہاتھ آئی ہے۔ — ایسا لیڈر جو ضرورت سے زیادہ خوبیوں کا مالک ہے۔ اسکے کارناموں کی فہرست اوائل کار ہی میں خاصی لمبی ہوتی جارہی ہے،

پہلا شاندار کارنامۂ جرأت اس کا یہ ہے کہ پیر کی طرف سے خلافت عطا کرنے کی جو رسم اہلِ طریقت میں مدّت سے چلی آرہی تھی اس پر اس نے دن کی روشنی میں خطِ استرداد کھینچا اور مسندِ خلافت پہ ٹھیک اس طرح قبضہ کر لیا جس طرح زیرِ زمین سازشوں کے ذریعے تخت اور کرسیاں قبضالی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو غریقِ رحمت فرمائے۔ ان کی رائے میں تو صاحب زادے اسعد میاں پیر بن بیٹھنے کے اہل نہ تھے۔ اسی لئے انھوں نے جیتے جی صاحبزادے کو مجاز نہیں بنایا، لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی ایسی ہوا چلی کہ نااہلی اہلیت میں تبدیل ہوگئی اور اہلیت بھی اس شان کی کہ بعض مریدانِ خاص کی تحقیق اور کشف کے مطابق باپ بھی اُن بلندیوں تک نہیں پہنچا تھا جہاں بیٹا پہنچ گیا ہے۔ اللھم زدفزد۔

دوسرا کارنامۂ سیاست اس کا یہ ہے کہ جمعیۃ کے جس تختِ صدارت پر اس کا بہادر، جفاکش اور جہاد پیشہ باپ تشریف فرما رہا تھا اس پر ایک زندہ لاش کو لاکر اس نے سجایا — سجایا کیا یوں کہیئے داؤ پیچ کی کیلیں اور قبضے ٹھونک کر جمایا اور سادہ لوح عوام کو یہ باور کرانے کی مضحکہ خیز کوشش کی کہ طریقت کی طرح سیاست میں بھی "تبرّک" ہی کو تفوّق حاصل ہے۔

تیسرا — نہایت ممتاز کارنامۂ دیانت اس کا یہ ہے کہ اس نے ادنیٰ جھجک کے بغیر ایک ایسی ہستی پہ خیانت کا الزام ڈنکے کی چوٹ عائد کیا جسے خائن سمجھنے کے لئے بھینس جیسا جسیم شحیم دماغ اور ہاتھی جیسا طویل و عریض قلب درکار تھا۔ یہ ہستی نہ صرف یہ کہ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کا دستِ راست رہی ہے بلکہ جمعیۃ نے اسے اپنا ورکنگ صدر بھی بنایا تھا۔

چوتھا کارنامۂ بلاغت اس کا یہ ہے کہ صحافت کو یاوہ گوئی اور ہلّڑ بازی کا ہم معنی بنانے کے لئے اس نے ایسے قلمکاروں کی ٹیم مرتب کی جو یہ پروا بالکل نہ کریں کہ علم و متانت اور شرم و غیرت کی حدیں کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہیں۔

پانچواں کارنامۂ شجاعت اس کا یہ ہے کہ چشمِ یار کی ایک ہی شہ میں اس نے مجلسِ مشاورت کے اراکین کو فرقہ پرستی کے الزام سے نواز دیا اور دعویٰ اس کا یہ ہے کہ سوائے میرے اس لیں میں جو بھی مسلمان رہنما بستے ہیں وہ فقط گھانس کھاتے اور زہر اگلتے ہیں —

کہاں تک شمار کرائیے۔ انا ولا غیری کا کوس پورے زور سے بج رہا ہے۔ انتشار کی ماری قوم کے شریانوں میں اتحاد و اخوت کے لہو کی جو چند بوندیں باقی بچ رہی ہیں انھیں بھی کھینچ لینے کی سعی شد و مد سے ہو رہی ہے۔ سنا تو ہے کہ اس بگڑتی ہوئی صورتِ حال کی اصلاح کے لئے جمعیۃ ہی کے کچھ دردمند اور مخلص اربابِ جد و جہد کرنے جا رہے ہیں۔ ان سطور کو لکھتے وقت اطلاع ملی ہے کہ بھوپال میں کوئی اجلاس ہونے والا ہے۔

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

قرآن کا مطالعہ کیسے؟

اپنے موضوع کی نہایت بیش قیمت کتاب ہر مسلمان کیلئے مفید اور مشعلِ راہ — ایک روپیہ ۲۵ پیسے — (مکتبہ تجلّی۔ دیوبند)

بے لاگ سچائیاں

مولانا مودودی اور عصمتِ انبیاءؑ

"اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ وہ بشر ہیں خدا نہیں!" (تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۴۲)

مولانا مودودی کی یہ عبارت ایک ایسے مضمون کے آخری حصے میں ہے جس میں مولانا نے حضرت داؤد علیہ السلام پر لگائے ہوئے ایک بہتان کی حقیقت کھول کر عصمتِ انبیاء علیہم السلام ثابت کی ہے۔ مگر داد دیجئے اُن لوگوں کی سخن فہمی کی جنھوں نے خود اسی مضمون کو عصمتِ انبیاء کے خلاف ثابت کر ڈالا۔

عصمتِ انبیاء ایک ایسا عقیدہ ہے جس پر تمام اہلِ سنت بلکہ تمام اہلِ حق متفق ہیں اور مولانا مودودی بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اسی "تفہیمات" کے حصہ اوّل میں اور تفہیم القرآن میں حضرت آدمؑ، حضرت یونسؑ، حضرت یوسف اور حضرت داؤد علیہم السلام کے حالات میں اسے ایک اصولِ مسلّمہ کے طور پر رکھ کر بحث کی ہے۔ البتہ وہ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کو معصوم نہیں سمجھتے جیسے کہ تمام اہلِ سنت کا عقیدہ ہے۔ وہ "رسائل و مسائل" جلد اول میں صفحہ ۵۰ پر لکھتے ہیں۔ "میں انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کو معصوم نہیں سمجھتا۔" امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اور نسفیؒ نے مدارک میں ان سے نقل کرتے ہوئے عصیٰ آدم ربّہ فغویٰ کی تفسیر میں اس مسئلہ پر ایک مفصّل بحث لکھی ہے اور اپنی یہی رائے دی ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے کبھی نہ صغیرہ کا ارتکاب کیا اور نہ کبیرہ کا۔ عصمت ان کی ذاتِ مبارک کو لازم ہے۔ انھوں نے نبی ہو کر کبھی بھی کسی معصیت کا ارتکاب نہیں کیا۔ مگر یہ کمال ان کا اپنی کا نہیں اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے۔ جیسے کہ قرآن میں ہے:-

وَلَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل)	اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ آپ ان (دشمنانِ دین) کی طرف ضرور کچھ نہ کچھ مائل ہو جائیں

لیکن ایک اور پہلو بھی ہے جو قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے کئی ایسے مقامات گنوائے ہیں جن میں انبیاء علیہم السلام کو ان کے کسی فعل پر تنبیہ بھی فرمائی ہے۔ آدم علیہ السلام کا شجر تناول فرما لینا۔ یونس علیہ السلام کا قوم کو چھوڑ کر چلے جانا حضرت داؤد علیہ السلام کی ایک فقرے میں آزمائش وغیرہ کے واقعات قرآن میں درج ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فداہ ابی وامی کا عبد اللہ ابن ام مکتوم سے منہ پھیرنا، شہد کھانے سے قسم کھا لینا، اسیرانِ بدر سے فدیہ قبول کر لینا اور غزوے سے جھوٹی معذرت کرنے والوں کو رخصت دے دینا وغیرہ ایسے امور ہیں جن پر قرآن نے انتباہ کیا ہے۔ جن سے دشمنانِ اسلام اور منکرینِ حدیث نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انبیاء کی سنّت قابلِ اعتماد چیز نہیں ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر آپکو سمجھ سے

کام لینا ہوگا اس عصمت کی حقیقت کیا ہے جو ان حالات کے باوجود اپنی جگہ قائم ہے اور ان کی سنت قابلِ اعتماد اور اسوۂ حسنہ بھی ہے۔ یہی وہ جرم ہے جو مولانا مودودی نے کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی عصمت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کوئی کام بھی کبھی بھی نافرمانی کے ارادے سے نہیں کرتے۔ وہ نہ گناہِ کبیرہ کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ صغیرہ کا۔ وہ ساری عمر خدا کی بخشی ہوئی توفیق سے ہر قسم کی بدنیتی اور بدعملی سے محفوظ و مامون رہتے ہیں، مگر اس پاک زندگی میں دو چار مواقع ایسے ضرور آگئے ہیں جن میں وہ خدا کی پوری رضا کو نہیں پا سکے۔ وہ انتہائی پاکیزگی کے باوجود معیارِ مطلوب برقرار نہیں رکھ سکے۔ قرآن اس کا شاہد ہے۔ اس پر خدا تعالیٰ نے انتباہ فرمایا۔ جیسے کہ اوپر مذکور ہوا اور ان کی اصلاح کردی۔ مگر چونکہ وہ فعل بھی بجائے خود حُسنِ نیت کے ساتھ صادر ہوئے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن پر کوئی سزا دی اور نہ وہ شریعت کے نقطۂ نظر سے کسی بھی درجہ میں کوئی معصیت یا گناہ شمار ہوتے ہیں نہ کبیرہ نہ صغیرہ۔ مگر وہ قابلِ اقتداء بھی نہیں ہیں۔ خود قرآن میں ابراہیم علیہ السلام کا حال بیان فرما کر جب ایک قابلِ اقتداء نمونہ پیش کیا تو ساتھ ہی خود استثناد کے طور فرمایا:۔

اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ۔ (الممتحنہ)

مگر ابراہیم علیہ السلام کی وہ بات جو انھوں نے اپنے (کافر) باپ کے متعلق کہی کہ میں تیرے لئے استغفار کروں گا الخ

ان افعال کو کتبِ اصول میں زلّت کہا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں لغزش (SLIPPING) نور الانوار کے باب افعال النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے جسے سب علماء پڑھتے پڑھاتے ہیں:۔

افعال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوی الزلۃ اربعة اقسام مباح و مستحب وواجب وفرض وانما استثنی الزلة لان الباب لبیان اقتداء الامة به والزلة لیست مما یقتدی به وھی اسم لفعل حرام وقع فیه بسبب القصد لفعل مباح فلم یکن قصدہ للحرام ابتداءً ولا یستقر علیه بعد الوقوع کمثل من اعنی فی الطریق فخر منه ثم قام عاجلا فما کان من قصدہ الخرور وما استقر علیه

لغزش سے قطع نظر کرکے باقی افعالِ نبی چار قسم ہیں۔ جائز، مستحب واجب اور فرض۔ لغزش کو الگ اس لئے کیا کہ یہ بحث (اقتداء امت کیلئے ہے اور لغزش کوئی اقتداء کرنے کی چیز نہیں ہوتی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی غیر جائز کام اس لئے ہوگیا کہ وہ اپنے خیال میں ایک جائز کام کرنے لگے تھے نہ ارادہ حرام کا تھا اور نہ اس پر قائم رہے بس جیسے کوئی راستے میں ذرا ایک طرف جھکا اور گر گیا۔ اور پھر جلد کھڑا ہوگیا۔ نہ گرنے کا ارادہ تھا نہ اس حال پر زیادہ ٹھیرے۔

اس میں عربی الفاظ خاصے سخت ہیں۔ معلوم نہیں ان پر فتوے کیوں صادر نہ ہوا اور کیوں اُسے پڑھا پڑھایا جارہا ہے۔ پھر حسامی میں یہی باب دیکھئے لکھا ہے:۔

وفیها ای فی افعال النبی صلی اللہ علیه وآله وسلم قسم آخر وھو الزلة ولیس من ھذا الباب فی شیئ لانه لایصلح للاقتداء ولا یخلو من الاقتران ببیان انه زلة

افعال نبی کی ایک اور قسم بھی ہے اور وہ ہے ان کی لغزش مگر وہ اس باب سے خارج ہے کیونکہ وہ قابلِ اتباع نہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ وہ تو ایک لغزش ہے۔

یہ زلّت کا لفظ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ (سورہ بقرہ) سے لیا گیا ہے اور اس موقع پر خود مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کا معنی لغزش کے لفظ سے کیا ہے۔ اب اگر یہی لفظ مولانا مودودی بھی استعمال کرتے ہیں اور یہی لفظ از روئے لغت و استعمال بھی صحیح ہے تو آخر انھوں نے کیا جرم کیا ہے؟

اب فرمائیے یہ لغزش خدا تعالیٰ کی حفاظت کے ذرا دیر کے لئے جدا ہو جانے سے ہوئی تھی یا اس کی حفاظت کے باوجود ہوئی تھی اگر خدا کی حفاظت کے باوجود ہوئی تو بڑی کمزور ہوئی خدا کی وہ حفاظت نعوذ باللہ من ذالک اور اگر اس کے جدا ہو جانے کی وجہ سے ہوئی اور یہی ظاہر ہے تو مولانا مودودی نے کیا غلط کہا ہے۔

اب ذرا معترض کے الفاظ دیکھئے۔ مولانا مودودی نے لکھا تھا کہ:۔

"خدا نے ایک دو لغزشیں ہو جانے دی ہیں۔"

اور یہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"خدا بھی گناہ کرواتا ہے۔"

یہ ہے ترجمانی جو مولانا مودودی کی کی جا رہی ہے۔ "ہو جانے دینا" اور "خود کروانا" میں جو فرق نہیں سمجھ سکتے وہی فتوے لگاتے ہیں ؎

خدا نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے؟

مولانا مودودی پر تو وہ فتوے لگائے جا رہے ہیں مگر جس جلالین میں انبیاء علیہم السلام کے حق میں اسرائیلی تہمتیں اور بہتان درج ہیں۔ وہ داخلِ نصاب ہے اور اس کے مصنفین پر تو کوئی فتویٰ صادر نہیں ہوتا ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

اب یہ بات تو واضح ہو گئی کہ لفظ لغزش جسے عربی میں زلۃ کہا جاتا ہے بالکل صحیح ہے۔ صراح میں دیکھئے زلّۃ کے معنیٰ "بلغزید" لکھا ہے۔ نور الانوار کے حاشیئے پر مولانا عبد الحکیم نے قمر الاقمار میں زلت کے معنی لغزش درج کیا ہے اور مدارک سورۃ بقرہ صـ۵۳ میں ہے:۔

فهذا دليل على انه يجوز	یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ لفظ
اطلاق اسم الزلة على	لغزش کا اطلاق انبیاء پر صحیح
الانبياء كما قال مشائخ	ہے جیسے کہ مشائخ بخارا نے کہا
بخارا فانه اسم فعل	ہے کیونکہ اس کا مطلب ہے
يقع على خلاف الامر من	خلاف امر بغیر ارادۂ مخالفت صادر
غير قصد الى الخلاف	ہو جانا۔ جیسے کوئی کیچڑ میں چلتے
كزلة الماشي في الطين۔	ہوئے پھسل جائے!

رہی یہ بات کہ پھر تو انبیاء علیہم السلام کی سیرت ناقابل اعتماد ہو گئی۔ کیا خبر کہ ہم ان کے جس فعل کو بھی لیں اس میں ان سے خطا ہو گئی ہو تو یہ بڑا اہم سوال ہے۔ اسے منکرین حدیث نے اچھالا ہے۔ اس کا جواب مولانا مودودی نے ہی کتنا صاف اور کتنا دلکش دیا ہے۔ انھوں نے منکرین حدیث کے ایک لیڈر کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے ترجمان القرآن منصب رسالت صـ۸۷ پر لکھا ہے:۔

"دوسری آیات جو آپ نے پیش فرمائی ہیں ان سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے فیصلوں میں بہت سی غلطیاں کی تھیں جن میں سے اللہ میاں نے بطور نمونہ یہ دو چار غلطیاں پکڑ کر بتا دیں تاکہ لوگ ہوشیار ہو جائیں۔ حالانکہ دراصل ان سے نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس وہی چند لغزشیں ہوئی ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرما دی اور اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ اس پوری سنت کی پیروی کر سکتے ہیں جو آپ سے ثابت ہے کیونکہ اگر اس میں کوئی اور لغزش ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی برقرار نہ رہنے دیتا جس طرح ان لغزشوں کو اس نے برقرار نہیں رہنے دیا ہے۔"

جو لوگ مولانا مودودی کی محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی زندگی میں نہیں صرف الفاظ میں دیکھنا چاہتے ہوں وہ اس منصب رسالت کو ضرور پڑھیں جو اب کتابی شکل میں "سنت کی آئینی حیثیت" کے نام سے چھپ گئی ہے اور وہ مقدمہ پڑھیں جو نعیم صدیقی کی کتاب "محسن انسانیت" کے شروع میں نہایت مختصر مگر مؤثر ترین الفاظ میں لکھا ہوا ہے

(اگلے شمارے میں "شرعی سزاؤں کا مسئلہ" ملاحظہ فرمائیے)

مولانا عبدالرؤف رحمانی

جب اسلام کارفرما تھا

غیر مسلم رعایا کے حقوق کا احترام و تحفظ

(۱) ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک منافق مسلمان مقدمہ لیکر آیا۔ مدعیٰ علیہ ایک یہودی تھا۔ آنحضرتؐ نے معاملہ پر غور فرمایا تو فیصلہ مسلمان کے خلاف یہودی کے حق میں دیا۔ اب یہ مسلمان یہودی کو کھینچ کر حضرت عمرؓ کے پاس لے گیا۔ یہودی نے حضرت عمرؓ سے یہ بات کہدی کہ اس کا فیصلہ آپ کے پیغمبرؐ میرے حق میں کر چکے ہیں۔ مسلمان نے مجبوراً اس کی تصدیق کی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اچھا ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔ پھر آپ گھر میں آئے اور ایک چمکتی ہوئی تلوار لیکر نکلے۔ پھر چشم زدن میں اس مسلمان منافق کے دو ٹکڑے کر کے فرمایا کہ اس بدبخت کی یہی سزا ہے جو رسول اللہؐ کے فیصلہ پر راضی نہ ہو۔

اس سے سبق ملا کہ حق و انصاف کے معاملہ میں کسی غیر مسلم پر مسلم کو ترجیح نہ ہوگی جو حق پر ہوگا فیصلہ اسی کے حق میں دیا جائے گا۔

(۲) ایک بار حضرت عمرؓ کے پاس ایک مسلمان اور ایک یہودی کا معاملہ پیش ہوا۔ حضرت عمرؓ نے ہر پہلو سے غور کیا تو یہودی کا دعویٰ درست نظر آیا اور اسی کے حق میں آپ نے فیصلہ دیدیا۔ یہودی نے خوش ہو کر کہا واللہ لقد قضیت بالحق قسم بخدا آپ نے بالکل حق فیصلہ فرمایا۔

(۳) حضرت عمرؓ کو مسلمانوں سے بے حد محبت اور کفر سے بے حد نفرت تھی لیکن اس نفرت نے انھیں متعصب نہیں بنایا تھا چنانچہ غیر مسلم رعایا کے ساتھ انصاف کرنے میں شمہ برابر لاپروائی اور تساہل نہ برتتے۔ آپ کے ذاتی تعلقات بھی بہت سے غیر مسلموں سے تھے۔ چنانچہ بارہا ان کے لئے بازار سے قیمتی چیزیں خرید کر تحفۃً دیتے۔

(۴) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے غیر مسلم رعایا اور ذمیوں کی نگہداشت پر بڑی توجہ مبذول فرمائی۔ آپ نے خلیفہ ہو جانے کے بعد تمام عمال و حکام کو فرمان بھیجا کہ مجھ سے پہلے خلیفہ کے دور میں جو حق تلفیاں اور مظالم ہوئے ہوں ان کا پتہ لگایا جائے حقداروں کو ان کے تلف شدہ حقوق دلاتے ہوئے مظالم کی تلافی کی جائے۔ بعض حق داروں کا انتقال ہو گیا ہو تو ان کے مال مغصوبہ کو ان کے ورثاء کو دیدیا جائے۔

(۵) اسی طرح آپ نے ایک فرمان یمن کے حاکم عروہ کے نام بھیجا اور اس میں سختی سے لکھا کہ مجھ سے پہلی حکومت میں رعایا پر جو مظالم روا رکھے گئے ہوں اور حکومت کی طرف سے عامۃ الناس کو جو نقصانات پہنچائے گئے ہوں ان سب کی پوری پوری تحقیق کی جائے اور سب کا معاوضہ ادا کیا جائے مزید فرمایا کہ اگر کسی کی ایک بکری بھی ظلماً لی گئی ہو تو خبردار اسکی بکری فوراً واپس کرو مجھ سے دوبارہ یہ نہ پوچھنا کہ کالی بکری واپس کریں یا بھوری سفید واپس کریں یا چتکبری

آخر میں فرمایا کہ سابقہ حکومتوں میں کئے گئے مظالم و نقصانات کی فی الفور تلافی کرو اور ٹال مٹول سے ہرگز کام مت لو۔

(۶) خلافت راشدہ میں ذمیوں (غیر مسلم شہریوں) کے حقوق کس قدر محفوظ تھے اور ان کے حقوق کا کس قدر احترام ملحوظ خاطر تھا ذیل کے واقعات سے ان کا تھوڑا سا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک بار حضرت عمرؓ کے ایک گورنر عمیر بن سعد جو حمص پر مقرر تھے حضرت عمر کے پاس آئے اور استعفاء داخل کرنے لگے حضرت عمر نے نامنظور فرما کر حکم دیا کہ تم اپنی عملداری پر واپس جاؤ حضرت عمیر بن سعد نے قسم کھا کر کہا کہ مجھے وہاں ہرگز نہ بھیجئے وہاں خراج وغیرہ کی وصولی میں سختی کرنی پڑتی ہے حتی کہ ایک بار ایک ذمی کو میں نے اخزاک اللہ کہدیا کہ خدا تجھے رسوا کرے۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذمیوں کو سخت سست کہنے سے منع فرمایا ہے لہٰذا آئندہ اس عملداری سے مجھے معاف رکھیئے۔

(۷) ایک بار خلیفہ ہارون رشید نے بنی تغلب کے عیسائیوں ذمیوں کے بعض معاملات میں دست اندازی کا ارادہ ظاہر کیا تو امام محمدؒ نے ان کو لکھا کہ یہ عیسائی جن خلاف ورزیوں کے مرتکب ہیں ظاہر ہے کہ وہ عہد خلافت سے ہے کچھ آج نئی بات نہیں ہے تو جب ان خلاف ورزیوں کے باوجود خلفاء نے باز پرس نہیں کی تو آپ کو بھی دست اندازی نہ کرنی چاہیئے۔ اس پر ہارون رشید نے نہایت سعادتمندانہ جواب دیا کہ بہت اچھا جیسا اب تک ہوتا آیا ہے ویسا ہی آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

(۸) ذمیوں کے مملوکہ مقامات پر کوئی شخص ناجائز تصرف نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ولید بن ہشام کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے قنسرین کا حاکم بنا کر بھیجا تو امیر المومنین کا ان کے پاس حکم نامہ آیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ قنسرین کے ذمیوں کے بعض مکانات پر مسلمان قابض ہیں اگر ہمارے عہد خلافت میں یہ فیصلہ ہوا ہے تو ان کو نکال دو اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بعض لوگوں کو نکالنے لگے تو ذمیوں نے خود ان سے استدعا کی کہ آپ ان کو آباد رہنے دیجئے ہم لوگ تو صرف آپ کا عدل اور اپنا استحقاق دیکھنا چاہتے تھے۔

(۹) تاتار کے سلطان قطلوشاہ کے پاس ایک جنگ میں مسلمان اور یہود و نصاریٰ کی ایک بڑی جماعت گرفتار ہوکر آئی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ قطلوشاہ کے پاس پہنچے اور آپ نے قیدیوں کی آزادی کی استدعا فرمائی بادشاہ بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آیا اور اس نے سب مسلمانوں کی آزادی کا حکم دیدیا شیخ الاسلام نے کہا کہ آپ اہل اسلام کے ساتھ یہود و نصاریٰ کو بھی آزاد کریں جن کے جان و مال کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں۔ شیخ الاسلام کی باتیں اس کی سمجھ میں آگئیں اور اس نے تمام ذمیوں کو بھی آزاد کر دیا۔

غیر مسلم رعایا کے عبادت خانے

(۱) اللہ تعالیٰ نے عبادت گاہوں کے ذکر میں مساجد کے ساتھ "صوامع و بیع" کا تذکرہ کرکے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ مسلمانوں کو دوسروں کے مقدس عبادت خانوں گرجا مندر وغیرہ کا بھی احترام کرنا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک میں بھی اس امر کی تاکید ہوئی ہے آپ سالاران لشکر سے فرمایا کرتے تھے (۱) کسی کا مُثلہ نہ کرنا (۲) کسی بچہ کو قتل نہ کرنا (۳) کسی بڈھے اور عورت کو قتل نہ کرنا (۴) کسی درخت کو نہ جلانا (۵) کسی کی بکری اور گائے اور اونٹ کو ذبح نہ کرنا (۶) گرجا اور گرجوں میں رہنے والی جماعت

کو نہ چھیڑنا۔

(۲) خلافت صدیقی میں حضرت خالد نے مشرکین حیرہ کے ذمی ہونے کے بعد یہ شرط کر لی تھی کہ ان کے گرجے اور عبادت خانے نہ گرائے جائیں اور نہ ان کے کسی مکان کو بلاوجہ منہدم کیا جائے اور نہ ناقوس بجانے سے ان کو روکا جائے اور نہ تہوار کے دن صلیب کا جلوس نکالنے میں رکاوٹ ڈالی جائے نیز ان کے مذہبی پیشوا پادری وغیرہ سے جزیہ نہ لیا جائے۔

حضرت ابوبکرؓ نے ان کے تمام حقوق کو تسلیم کیا اور سرکاری مہر اور اپنے دستخط سے اس کی توثیق فرما دی۔

(۳) اسی طرح حضرت خالد نے دمشق والوں کے صلح نامہ میں لکھا تھا "اہلِ دمشق کے جان و مال اور عبادت خانوں کو امان ہے"۔

(۴) اسی طرح خلافت فاروقی میں جب حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے اہلِ شام سے صلح کی تو اس میں یہ وضاحت کر دی کہ مسلمان ان کے گرجا اور عبادت گاہوں کو نہ چھیڑیں گے۔

(۵) حضرت عمرؓ بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوئے نماز کا وقت آ گیا پادری نے حدود گرجا میں نماز کی اجازت دیدی لیکن حضرت عمرؓ نے اسے پسند نہ فرمایا اور کہا کہ اگر میں یہاں نماز پڑھ لوں گا تو اندیشہ ہے کہ میرے بعد مسلمان اس گرجا پر قبضہ کر لیں گے اور دلیل یہ پیش کریں گے کہ عمرؓ نے یہاں نماز پڑھی تھی چنانچہ حضرت عمرؓ نے گرجا کے باہر سیڑھیوں پر نماز ادا کی اور پھر بھی بطور احتیاط اس کے متعلق بھی پادری کو ایک فرمان لکھ کر دیا کہ آئندہ سیڑھیوں پر نہ کوئی نماز ادا کرے اور نہ اذان دے۔

(۶) حافظ ابن حجرؒ نے اس موقعہ پر ایک اور واقعہ نقل کیا ہے کہ آپ نے اس گرجا کے قریب نماز پڑھی جو حضرت مریم کی طرف منسوب ہے۔ اتفاقاً آپ کو اس جگہ تھوکنے کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے اپنے کپڑے (رومال) میں تھوک لیا۔ لوگوں نے کہا آپ اس زمین پر تھوکتے اس پر کوئی حرج نہیں یہاں تو مریم کی پرستش ہوتی ہے اور مشرکانہ رسوم ادا کیے جاتے ہیں تو ایسی جگہ کا اس قدر احترام کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا۔ ہاں لیکن اللہ کا ذکر بھی یہاں بہت ہوتا ہے

(۷) حبیب بن مسلمہ ایک بڑے جنگ آزمود سپہ سالار تھے حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں انہوں نے بہت سی فتوحات کیں علاقہ دبیل کو جب فتح کیا تو ذمیوں کو یہ معاہدہ لکھ کر دیا کہ تمہارے جان و مال اور گرجاؤں کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے جب تک تم جزیہ و خراج کے پابند رہو گے ہم پوری طرح ایفاء عہد کریں گے۔

(۸) حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں حسان بن مالک مسلمان اور دمشق کے ایک غیر مسلم باشندہ کے درمیان ایک گرجا کے معاملہ میں جھگڑا واقع ہوا مسلمان نے جواب دیا کہ یہ گرجا میرے مقبوضات میں واقع ہے اور یہ جاگیر مجھے دمشق کے فلاں امیر نے باضابطہ طور پر لکھت پڑھت کر کے دی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا پھر بھی ہم تم کو گرجا پر قبضہ کسی طرح نہیں دیا جا سکتا۔

(۹) اسی طرح علی بن ابی حجلہ فرماتے ہیں کہ دمشق کے ایک عجمی سے اور مجھ سے ایک گرجا کے معاملہ میں نزاع ہوا بنو نصر خاندان کے امیر نے مجھے ایک جائداد دی تھی۔ اس میں یہ گرجا بھی شامل تھا ہم نے اپنی دستاویز وغیرہ پیش کیں لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ہمارے کاغذات پر ذرہ برابر التفات نہ فرمایا اور ہم سب کو وہاں سے نکال دیا اور گرجا اور اس کے متعلقہ حدود کو نصاریٰ کے حوالہ کر دیا۔

(۱۰) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس امر کی آزادی دے رکھی تھی کہ اگر کوئی غیر مسلم (ذمی) اپنے گرجا کے لئے اپنے مال اور زمین و جائداد میں سے کچھ

وقف کرنا چاہے تو بخوشی کر سکتا ہے۔

(۱۰) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ گرجا کے حدودِ اربعہ کا بھی احترام فرماتے تھے یعنی گرجا کے علاوہ اس کے متعلق جو زمین ہوتی تھی اس پر بھی کسی کو قبضہ و تصرف کی اجازت نہ تھی چنانچہ دمشق کی مشہور تاریخی مسجد جامع بنی امیہ کی تعمیر میں عیسائیوں کی ایک زمین کا شامل کرنا ضروری تھا جو حدود گرجا میں واقع تھی خلیفہ وقت عبدالملک نے عیسائیوں سے اسے قیمتاً لینا چاہا لیکن عیسائیوں نے انکار کر دیا جب باپ کے انتقال کے بعد ولید بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اس نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا تاکہ مسجد جامع بنی امیہ کی تکمیل ہو جائے۔ اس کی پیشکش تھی کہ ہم منہ مانگے دام دیں گے مگر عیسائیوں نے پھر بھی انکار کیا اور کہا کہ جو بھی ہمارے گرجا کو صدمہ پہنچائے گا وہ مجنوں اور پاگل ہو جائے گا۔ ولید نے غصہ میں آکر گرجا کا کچھ حصہ منہدم کرا دیا اور سب سے پہلے ظالم نے خود کدال چلائی۔ ولید کی یہ راج ہٹ اور مسجد کی اس طرح تکمیل اسلامی اعتبار سے ایک مجرمانہ حرکت تھی۔ چنانچہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ آیا تو آپ نے فرمان جاری کیا کہ گرجا کی جس قدر زمین مسجد میں شامل کی گئی تھی وہ عیسائیوں کو واپس دی جاتی ہے۔ مسلمان احتجاج کرنے لگے کہ یہ کیا ستم ہے ہم نے تو اس مسجد میں نماز پڑھی ہے کیا اب یہ مسجد ڈھائی جائے گی؟ ـــــ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا ہاں ضرور وہ حصہ ڈھایا جائے گا جس پر ناجائز تسلط کیا گیا ہے اور اسے عیسائیوں کو دیا جائے گا۔ اب تو مسلمان بہت پریشان ہوئے اور سربرآوردہ حضرات کا ایک وفد عیسائیوں کے پاس دوڑ گیا۔ منت سماجت کی۔ شاید کچھ مال بھی دیا ہو۔ تب کہیں عیسائی حضرات رضامند ہوئے اور ایسا راضی نامہ لکھ کر دیا کہ ہم اپنی زمین واپس لینے کے لئے مسجد کا کوئی حصہ منہدم کرانا پسند نہیں کرتے۔ یہ راضی نامہ دیکھنے اور اس کی تصدیق کر لینے کے بعد ہی حضرت عمرؓ نے اپنا فرمان واپس لیا۔

(۱۲) حضرت عمر بن عبدالعزیز کو ذمیوں کے علماً اور پادری صاحبان سے بھی شمہ برابر تعصب اور عناد نہیں تھا۔ اس کے برخلاف آپ نے انھیں گرانقدر امدادیں بھی دی ہیں۔ ایک پادری کو انھوں نے ایک ہزار اشرفیاں دیں۔

(۱۳) حضرت عمر بن عبدالعزیز کا مدینہ منورہ میں جو دفتر تھا اس کے انچارج عیسیٰ بن ابی عطا تھے وہ لبسا اوقات خلافت کے حسب ہدایت غیر اقوام کے مذہبی لوگوں کی امداد کرتے رہے۔

(۱۴) ہارون رشید کے دورِ خلافت میں گرجا کے پادریوں کے ساتھ کافی مراعات و سلوک کا دستور تھا۔ گرجا کے پادری خواہ کیسے ہی جاگیردار اور دولتمند ہوں ان سے خراج اور جزیہ کی معافی کا دستوری اعلان کیا گیا تھا۔

(۱۵) گرجا اور پادریوں کے ساتھ مراعات و حسن سلوک کے اعتراف میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اپنی تالیف میں ایک پادری کا بیان نقل کرتے ہیں جسے مشہور ولندیزی مستشرق نے اپنی کتاب فتوحات شام میں نقل کیا ہے۔ نسطوری پادری کا بیان حسب ذیل ہے۔

"یہ عرب جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے ہمارے مالک بن گئے۔ مگر وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں اور پادریوں قدوسیوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجا و عبادت خانوں کو جاگیریں عطا کرتے ہیں۔"

مجالس الابرار — وعظ کی نرم و شیریں زبان میں مسائل شرعیہ اور اخلاق حسنہ کی تعلیم و تذکیر۔
ساڑھے تین روپے۔　　مکتبہ تجلّی۔ دیوبند

مستقل عنوان

مُلّا ابن العرب مکّی

مسجد سے میخانے تک

پانچ ہفتے یوں گذر گئے جیسے پانچ منٹ گذر رہے ہوں۔ اس بستی کا نام خواجہ آباد ہے۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ کم سے کم پانچ صدیاں یہیں گذاری جائیں۔ مگر ملائن کا دسواں خط بلائے بے درماں ثابت ہوا۔ اب بھی اگر میں ویسے ہی ٹال مٹول کا جواب لکھدیتا جیسے پچھلے ۹ خطوں کا لکھتا رہا تھا تو عین ممکن تھا کہ عاقبت ہی برباد ہوکر رہ جاتی۔

پچھلے نو خطوں میں اس نے کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ بس تقاضا ہی تقاضا کیا تھا کہ اب تو اتنے دن ہوگئے اب تو لوٹ آئیے۔ لیکن اس خط میں دھمکی بھی موجود تھی کہ منگل میں آپ گھر نہ پہنچے تو بدھ کی صبح کو میں ماموں لطافت کے ہمراہ خود آپ کے پاس پہنچوں گی۔

ماموں لطافت کا نام وہ نہ لکھتی تو میں اس کی دھمکی کو گیدڑ بھبکی تصور کرتا لیکن ان کا نام آجانے کے بعد ننانوے فیصد یقین کر لینا پڑا تھا کہ ضرور یہ دھمکی معرضِ عمل میں آکر رہیگی وہ مزاروں کے بڑے شوقین ہیں۔ خواجہ مرواریدؒ کا مزار یوں بھی خاصا شہرت یافتہ ہے۔ یہاں تک مشہور ہے کہ ہر نوچندی جمعرات کو ٹھیک تہجد کے وقت اس پر پریوں کا رقص ہوتا ہے جس میں جن صاحبان بالکل جدید قسم کا آرکسٹرا بجاتے ہیں۔ ہو نہو ماموں لطافت ہی نے ملائن کو ورغلایا ہوگا کہ ملّا برخوردار یوں نہیں لوٹیں گے تم خود وہاں جا دھمکو۔ اس پر ملائن نے کہا ہوگا کہ میں عورت ذات اکیلی کیسے جا دھمکوں۔ تب وہ سینہ تان کر بولے ہوں گے کہ سفر خرچ دلواؤ تو ساتھ چلنے لئے ہم موجود ہیں۔ ہاتھوں ہاتھ انھوں نے یہ بھی کوشش کی ہوگی کہ جھٹ پٹ رختِ سفر باندھ کر بس چل ہی پڑو مگر ملائن نے یا تو کفایت شعاری کے نقطہ نظر سے یا پھر اتمامِ حجت کے طور پر نوٹس نما خط لکھنا مناسب سمجھا ہوگا۔

اب ظاہر ہے کہ اگر وہ آہی دھمکتی تو بڑی صوفیائن کے پہلو بہ پہلو ایک چھوٹی صوفیائن کو دیکھ کر اس کی کھوپڑی اُلٹ جاتی۔ وہ ہرگز یہ ماننے کو تیار نہ ہوتی کہ یہاں آنے سے قبل مجھے ان صاحبہ کے وجود کا علم نہ رہا ہوگا — وہ لازماً یہی سمجھتی کہ آجتک جان بوجھ کر میں نے اس سے صوفی قمقم کے نکاحِ ثانی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اور اگر کسی طرح میں اسے یقین دلا ہی دیتا کہ اس نکاحِ ثانی کا پتہ تو خود مجھے بھی یہیں آکر چلا ہے تو یہ بہرحال وہ ہرگز نہیں مان سکتی تھی کہ دو تین دن کی بجائے پانچ ہفتوں کا لمبا قیام بھی یاسمین کے وجود سے کوئی ذہنی تعلق نہ رکھتا ہوگا۔

وہ کیا مانتی۔ خود میں بھی نہیں مانتا کہ یہ لمبا قیام صرف گنیش صاحب کی خاطر داریوں، صوفی صاحب کی شفقتوں اور بڑی صوفیائن کی محبت بھری نوازشوں ہی کا رہینِ منت رہا ہوگا یہ سب چیزیں بھی قوی اسباب کے درجے میں ضرور تھیں لیکن جھوٹ ہوگا اگر یہ اعتراف نہ کیا جائے کہ یاسمین کا وجود بھی ایک مستقل عامل کی حیثیت یقیناً رکھتا تھا۔

خیریت اسی میں نظر آئی کہ کل کسی وقت لازماً گھر پہنچ جایا جائے۔ یہ فیصلہ کر کے میں نے ملائن کا خط تہہ کیا اور لفافہ میں رکھ رہا تھا کہ دفعتاً عین عقب سے آواز آئی:۔

"بند نہ کیجئے۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔"

"یہ آواز سوائے یاسمین کے کس کی ہوتی۔ میں بوکھلا گیا۔

بوکھلانے کی وجہ یہ بھی کہ یہ خط تو میں پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ اگر یہاں کسی نے بھی پڑھ لیا تو مجھے رخصت کی اجازت دینے کے عوض اصرار کیا جائے گا کہ ملائن کو آنے دو۔ خصوصاً یاسمین تو ضرور ہی مصر ہو گی کیونکہ میں شامت کا مارا اشارۃً الفاظ میں ملائن کا غائبانہ تعارف کرا چکا تھا اور یہاں تک بتا دیا تھا کہ عمر میں بھی وہ تم سے کچھ زیادہ بڑی نہیں ہوگی۔

"نہیں جناب — یہ میرے ایک دوست کا پرائیوٹ خط ہے۔" میں نے لفافے کو جیب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

"میں تحریر دیکھ چکی ہوں — یہ خط تو بھابی کا ہے۔"

"پھر تو بالکل ہی پرائیوٹ ہے۔"

"پچھلے تو بھی پرائیوٹ ہی تھے — مگر انھیں آپ نے گھر میں کسی سے نہیں چھپایا۔"

"ضروری نہیں کہ جو حماقت نو بار کی جائے وہ دسویں بار بھی ضرور کی جائے۔"

"نہ سہی ضروری — لیکن فقط ایک بار عقل مندی کر کے آپ نو بار کی حماقتوں کے وبال سے نہیں بچ سکتے۔ پھر کیا فائدہ!"

یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ خط کی طرف بڑھا۔ میں نے قطعی ارادہ کر رکھا تھا کہ خط بالکل نہیں دکھاؤں گا مگر اس کے آگے کو بڑھتے ہوئے ہاتھ کی چوڑیاں اس طرح جھنکیں جیسے میری اپنی کھوپڑی میں کسی نے گھونگرو چھنکا دیئے ہوں۔ ذہن کی رَو جانے کہاں پہنچی اور دوسرے ہی لمحے خط اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے کھڑے ہی کھڑے پڑھا اور مسکرا کر کہنے لگی:۔

"تو یہ تھا پرائیوٹ! — چلئے آپ نے تعریفیں کر کر کے نسیم بھابی سے ملنے کا اشتیاق بھی بہت دلا دیا تھا۔"

پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خط لئے دالان میں چلی گئی۔ دو تین منٹ بعد میرے نام کی پکار ہوئی۔ بڑی صوفیائن دالان میں سے آواز دے رہی تھیں۔ میں سوچ میں ڈوبا وہاں پہنچا تو ارشاد ہوا:۔

"ارے بیٹا — آتے ہی نہ دکھایا مجھے یہ خط —"

"بھابی جان — آپ کی شفقت نے آج تک مجھے باندھے رکھا ہے — مگر اب میں نہ رُک سکوں گا۔"

"اے ہے بچے کیا اوندھی بات کرتا ہے — بیٹھ یہاں — میں تو پہلے ہی کے بار تجھ سے کہہ چکی ہوں کہ کبھی بہو کو بھی ساتھ لائے — اب اللہ اسے خود بھجوا رہا ہے تو تو بھاگنے کا نام لیتا ہے۔"

"اللہ نہیں بھابی جان۔ اسے میری شامت بھجوا رہی ہے وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

بھابی جان زور سے ہنس دیں۔

"شیطان کہیں کا — اچھا جا دیکھ گلدم کو بلا کر لا۔ میں اسے ابھی ڈھولی جانے کو کہونگی۔ وہ وہاں چودھری بیساکھی لال سے پرسوں کے لئے موٹر کو کہہ کر آئے گا — میری بہو بھیسڑے سے یہاں تک بہل تانگے میں تھوڑی آئے گی۔"

"آپ اسے ہوائی جہاز میں بھی بلوائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر میں کل ضرور دفع ہو رہا ہوں۔"

"بس بس۔ ایسا ہی تو لاٹ صاحب ہے — اے دلھن اس کی اچکن تالے میں رکھا دو — دیکھوں کیسے جاتا ہے۔"

"نہیں آپا — یہ اچکن کے بغیر بھی بھاگ سکتے ہیں" یاسمین بولی۔ "آپ کہیں تو خود انھی کو پرسوں تک ان کے کمرے میں مقفل کر دوں۔"

"ارے نہیں" صوفیائن نے اس طرح ترس کھایا جیسے سچ مچ میرے قیدی بنائے جانے کا خطرہ محسوس کیا ہو۔

"میرا گلا بھی کاٹ دیں آپ دونوں تب بھی میں خالی دھڑ سے بھاگتا چلا جاؤں گا۔ آپ نہیں سمجھتیں، وہ یہاں آ کر قیامت ڈھائے گی۔ ہفتے میں چار دن اس پر آسیبی دورے پڑتے ہیں۔"

"پڑتے ہوں گے" یاسمین بولی "آپ تو یہ بتائیے شام میں چاول کھا رہے ہیں یا شیرمال اور قورمہ؟"

"میں نابکار آج فقط لختِ جگر کھا رہا ہوں — یقین کیجئے میرا کل جانا بہت ضروری ہے۔"

"کر لیا یقین" یاسمین نے اطمینان سے کہا۔ "مزید

یقین آپ کل دلائیے گا۔ آج کا وقت برباد نہ کیجئے۔"
صوفی صاحب گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلی خبر انھیں بھی بطور خوش خبری یہی دی گئی کہ پرسوں مُلّا کی بانو تشریف لارہی ہیں۔
"بہت خوشی کی بات ہے۔ یہ یہاں اُکتا بھی رہے تھے کہ صبح جاؤں شام جاؤں۔ اب کم سے کم ایک مہینہ اور بندھے رہ سکیں گے۔" صوفی صاحب کی آواز میں بڑا پیار تھا۔

ایسے پُرکشش اور بندہ نواز قسم کے ماحول میں جی تو کس کافر کا نہ چاہے گا کہ مرمٹ ہوکر پڑا رہے لیکن دور اندیشی کا تقاضا کچھ اور تھا۔ اسی تقاضے کے تحت اگلے روز صوفی صاحب سے اجازت لینی ہی پڑی۔ انھوں نے مسلسل اصرار سے ہار کر اجازت دے تو دی مگر شرط یہی کہ بہت جلد ہیں اہلیہ سمیت واپس آرہا ہوں ان کی اجازت گویا گھر بھر کی اجازت تھی۔
اب ذرا سا مرحلہ گنیش چند صاحب سے رخصت کا تھا ان سے اجازت چاہی تو بُرا سا منھ بنا کر کہنے لگے:۔
"برخوردار میں اپنے مُنھ سے تو تمھیں اجازت دے نہیں سکتا۔ جاؤ بس دیکھ لی تمھاری سعادتمندی۔"
"ارے نہیں پروفیسر صاحب ـــ قسم ہے شاید مجبوری ہے ـــ آپ یقین کیجئے بہت جلد مع اہل وعیال لوٹ رہا ہوں۔"
"دیکھا جائے گا ـــ مگر تمھارا اعتبار نہیں ہے۔"
پھر جب انھوں نے سینے سے لپٹا کر مجھے رخصت کیا تو ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے ایک شفیق باپ اپنے بیٹے کو رخصت کر رہا ہو۔

بھیسر ٹے سے دیوبند تک اچھی خاصی مسافت ہے۔ بس کی جس سیٹ پر میں بیٹھا تھا اسی پر ایک کانگریسی مہاشے تشریف فرما تھے۔ اندر سے کچھ بھی رہے ہوں مگر لباس اور خاص کر ٹوپی سے وہ بہرحال کانگریسی تھے۔ دونوں زانوؤں پر آئل کلاتھ کا بیگ رکھا تھا اور ہاتھ میں اخباروں کا بنڈل سا تھا۔ میری آمد سے قبل ہی وہ پاس کی سیٹ پر آئے ہوئے ایک اور شریمان سے گرم گفتگو تھے۔ پاس والی سیٹ پر شریمان کے علاوہ ایک سردار صاحب نظر آرہے تھے جن کے گھٹنے پر رکھے ہوئے تھیلے سے رسائل واخبارات جھانک رہے تھے۔
میری توجہ ابتداءً باہر کے منظر پر رہی۔ دور تک پھیلے ہوئے کھیت آسمان کی طرف پیاسی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آسمان سپاٹ تھا۔ دفعتاً کانگریسی مہاشے کا قہقہہ میرے کانوں سے ٹکرایا۔ وہ ایک اخبار سے کچھ سُنا کر فرمائشی قسم کا قہقہہ اُڑا رہے تھے۔ سُننے والے برابر کی سیٹ کے شریمان تھے جو آگے کو جھک آئے تھے۔ میں نے رُخ بدل کر نظر ڈالی تو مہاشے کے ہاتھ میں "پرتاپ" نظر آیا۔
"۔۔۔۔ ایوب کے سر پر اتنی جوتیاں پڑی ہیں کہ زندگی بھر چندیا سہلاتا رہے گا۔"
یہ فقرہ پڑھ کر انھوں نے پرچہ تہہ کیا اور بنڈل سے پرتاپ کا ایک اور شمارہ نکالا۔
"ہمارے بہادر جوانوں نے پاکستان کی بزدل افواج کو ایسا ذلیل کیا ہے کہ تاریخ میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔" ـــ "پاکستان کی کمر پر ایسے جوتے پڑے ہیں کہ سارے اسلامی مجاہدوں کی ہوا نکل گئی ہے۔"
پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ ثابت ہوا کہ مہاشے جی نے خاص خاص فقروں پر ٹک مارک لگا رکھے تھے۔
"اگر پاکستان نواز قوتوں نے اپنے پٹھوں کو پٹتا ہوا دیکھ کر جنگ نہ بند کرادی ہوتی تو ہمارے جانباز بہادروں نے پاکستانی سانپ کے دانت ہمیشہ کے لئے توڑ کر رکھ دیئے ہوتے" ـــ "پاکستان کی چندیا پھر سہلا رہی ہے۔ اب کی اس بے ایمان کے اتنے جوتے رسید کئے جائیں گے کہ سر گنجا ہوکر رہ جائے گا۔"
یہ چیدہ فقرے انھوں نے مختلف پرچوں میں سے سنائے۔ ابھی شاید وہ اور سناتے کہ اچانک سردار جی بول پڑے:۔

"بس بادشاہاں - چُپ کرو - یہ زبان شریفاں دی زبان نہیں ہے۔"

مہاشے کو جیسے شاک سا لگا ۔۔۔

"کیا مطلب؟" انھوں نے کاٹ کھانے کے انداز میں کہا۔

"مطلب تو صاف ہی ہے - پاکستان دشمن سہی مگر دشمن کے لئے اس ٹائپ دا فقرے بھٹیاروں کی گالم گلوچ سے ملتے ہیں ۔"

"واہ سردار جی ۔۔۔ کمینے دشمن کو اور کیا آپ جناب سنائیں ۔۔۔"

"اچھا خیر ۔۔۔ آپنے یہ سب تو سنایا ۔۔۔ لیجئے ہم بھی آپ کو پرتاپ ہی سے ایک گل سناتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے انھوں نے جھٹ تھیلے میں سے کچھ اخبار نکالے اور ان میں سے پرتاپ کی ایک کاپی الگ کرتے ہوئے پُرجوش انداز میں آس پاس کے سبھی مسافروں کو مخاطب فرمایا:۔

"یہ دیکھ لیجئے ۳ر اکتوبر کا ایشو ہے۔" اخبار آگے کو بڑھاتے ہوئے انھوں نے موٹے قلم سے لکھی ہوئی تاریخ کے پاس انگلی رکھدی۔ ہم قریب کے سبھی مسافروں نے تاریخ پڑھی مہاشے کی پیشانی پر ساڑھے تین بل تھے مگر شریمان کا چہرہ کسی بھی قسم کے اثرات سے عاری تھا۔ سردار جی بلند آواز سے کہنے لگے:۔

"پرتاپ کے یہی ایڈیٹر صاحب جو آپ روزانہ پاکستان کی عبرت ناک شکست اور بھارت کی بے مثال فتح کی خبریں بڑے اینٹھ مروڑ کے ساتھ سناتے رہتے ہیں ۳ر اکتوبر کو خود اپنے قلم سے لکھ چکے ہیں کہ ۔۔۔۔" آج کون اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ اگر ہندوستان کے پاس دنیا کے باقی بیدا ملکوں کی طرح اتنی فوج ہوتی جتنی اس کی سرحدوں کی رکھشا کے لئے ضروری ہے تو ہماری چین اور پاکستان کے ہاتھوں ایسی درگت نہ ہوتی جو آج تک ہوتی رہی ہے۔"

اتنا پڑھ کر انھوں نے ماحول پر جائزہ لینے والی نظر ڈالی۔ مہاشے جی کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ بھووں پر تناؤ تھا۔ شریمان جی کا منھ کھل گیا تھا۔ آنکھوں میں حیرت جھلک رہی تھی ۔۔۔

"اب بتائیے بادشاہاں ۔۔۔ آج تو پرتاپ روز ایسی باتیں لکھتا ہے جیسے جنگ میں ہندوستان کو بس فتح ہی فتح نصیب ہوئی ہے اور پاکستان نے پٹنے کے سوا کچھ کیا ہی نہیں ہے ۔۔۔ مگر کل یہ کیا لکھ چکا ہے۔ یاد تو ہوگا میاں صاحب آپ کو بھی سن باسٹھ میں چین نے ہمیں کہاں پہنچایا تھا ۔۔۔"

میں براہ راست اپنے کو مخاطب پاکر ذرا سٹپٹا گیا ۔۔۔ سٹپٹانے کی بات ہی تھی۔ بھلا کیسے مانتا کہ پرتاپ نے ابھی ۳ر کو یہ لکھا ہوگا جو سردار جی نے سنایا۔ احتیاطاً میں نے اخبار ان کے ہاتھ سے لے لیا اور عینک کے شیشے صاف کر کے غور سے پڑھا۔ شریمان جی نے بھی نظریں گاڑیں۔ مہاشے جی بھی جھک گئے۔

الفاظ جوں کے توں تھے۔

"میرا خیال ہے سردار جی۔ یہ فقرے کسی قسم کے نشے کی رَو میں قلم سے نکلے ہیں ورنہ یہ تو سورج کی طرح روشن ہے کہ پاکستان کو ہم نے بھُس کے بھاؤ مارا ہے۔"

"بالکل صاحب ۔۔۔ ساری جنگ تو پاکستان کے علاقے میں ہی لڑی گئی ہے۔ ہماری دھرتی پر تو پاکستان کے ناپاک قدم پڑے ہی نہیں۔" مہاشے جی کی آواز میں بڑا جوش آگیا تھا۔

"پڑے کیسے نہیں۔ چھمب اور جوڑیاں کس کا ہے۔ ہمارا ہی تو ہے۔" سردار جی نے تڑاخ سے کہا۔

"وہ بات الگ ہے۔ کشمیر میں ہم نے بھی حاجی درہ پیر تک ترنگا لہرا رہا ہے۔"

"درہ حاجی پیر کہو بادشاہاں ۔۔۔"

"چلیئے وہی کہہ لیجئے۔" مہاشے بھنّا سے گئے "اصلی جنگ تو پنجاب سیکٹر پر ہوئی ہے ۔۔۔"

"پنجاب دا سیکٹر کی بات ہم سے پوچھو شریمان جی ۔۔۔ آپ تو یوپی سی پی میں بستر پر پڑے اکاش وانی سنتے رہے ہونگے بم کی آواز بھی کانوں میں پڑ جاتی تو کتی رات نیند نہ آتی ۔۔۔

پاکستانی بمباری سے اپنے پنجاب کی بیس ہزار سے زیادہ صنعتی یونٹوں کو نقصان پہنچا ہے۔ پانچ ہزار سے زیادہ مواضعات متأثر ہوئے ہیں۔ پر بادشاہاں اپنے کو اس کا گلہ پلہ کچھ نہیں۔ جنگ میں تو یہ ہوتا ہی ہے۔ دیش کی رکھشا کے لئے ہم اس سے کہیں زیادہ کٹھنائیاں بھوگنے کو تیار ہیں۔"

مہاشے جی کی آنکھوں میں بے اعتباری سی جھلکی۔

"پھر آپ پاکستان کو بُرا بھلا کہنے پر بُرا کیوں مناتے ہیں؟"

"او بادشاہاں ـــ بات کو سمجھا کرو۔" سردار جی نے بڑے جوش سے کہا۔ "بُرا ہم تھوڑی مناتے ہیں۔ ہمارا تو یہ کہنا ہے کہ پڑھنے لکھنے کا پھر کیا فائدہ اگر ہم بازاری زبان استعمال کرنے لگیں۔ اَول فَوْل بکنا تو کمزوری دا ثبوت ہے۔"

بس، ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ دیوبند آگیا تھا۔

گھر پہنچ کر کیا بیتی ـــ ملائن کے بگڑے ہوئے تیوروں سے کیسے نمٹا ہوا۔ یہ خاصی دلچسپ داستان ہے۔ کبھی موڈ ہوا تو اسے بھی گوشش گذار کروں گا۔ فی الحال نہ ملائن کے غمزوں میں دل ہے نہ صوفی قم قم یاد آرہے ہیں۔ کبھی کبھی گنیش چند یاد آجاتے ہیں مگر فوراً ہی ذہن یاسمین کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یاسمین کی یاد کے ساتھ ہی اس کا نائلون کا دوپٹہ کھوپڑی کی وسعتوں میں پھڑپھڑانے لگتا ہے اور پھر اتنا باریک اور پُر کشش کپڑا ایجاد کرنے والے امریکہ کی یاد ذہن کے پورے افق پر تھان کی طرح کھلتی چلی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے نائلون کسی اور مغربی ملک کی ایجاد ہو لیکن غذا کی ملک گیر قلّت کے پرابلم نے یادداشت کی تختی کچھ ایسی ہی بنادی ہے کہ امریکہ کے سوا کسی ملک کی یاد اس پر جمتی ہی نہیں۔ لال لال گیہوں والا امریکہ۔ پیٹن ٹینکوں اور سیبر جیٹ جہازوں والا امریکہ۔ گن داتا۔ ان داتا۔ دھن داتا۔ بس امریکہ کی یاد آتے ہی یاسمین تک کی یاد معدے کی ظلمتوں میں گم ہو جاتی ہے۔

اِدھر دوست احباب کا بھی یہ حال ہے کہ سارے سبق بھول گئے بس جب دیکھو سیاست۔ مرزا بلند اختر تک سیاست پر بور کرنے لگے ہیں۔ حالانکہ پہلے کبھی ان کی گفتگو فلم، آرٹ اور رومانس کے دائروں سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ خدا کی پناہ زبیدہ تک اخبار دیکھنے لگی ہے۔ وہ ملائن کی چچیری بہن ہے گاہے ماہے کئی کئی دن کے لئے آجاتی ہے آج کل بھی آئی ہوئی ہے۔ کل میں دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھامے یہ دماغ لڑا رہا تھا کہ بڑھتی ہوئی گرانی سے اُکتا کر اگر خودکشی کا پروگرام بنانا ہی پڑا تو اصلی زہر کہاں سے لایا جائے گا۔ کچھ دن ہوئے چونا قلعی کے سلسلے میں نیلا تھوتا منگوایا تھا تو مزدور اسے چونے میں حل کرنے سے قاصر رہا تھا اور عاجز آکر بولا تھا کہ صاحب یہ نیلا تھوتا ہے ہی نہیں۔

اتنے میں زبیدہ لپکتی ہوئی میری طرف آئی۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔

"اے ہے بھائی جان ـــ یہ کیسی خبر آئی۔"

میں نے بے تعلقی کے انداز میں اسے گھورا۔ وہ پلنگ پر دھری گئی۔

"اب تم بھی سیاست بگھاروگی" ـــ میں نے آنکھیں نکالیں۔

"ہائے اللہ۔ آپ تو لڑنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔"

"چلو تم شروع ہو جاؤ ـــ کیا خبر آئی ہے؟"

"پہلے آپ ذرا سا مسکرا دیجئے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔"

"اب زیادہ جان نہ جلاؤ۔ میں سیاست پر سو بار لعنت بھیجنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔"

"جب میں چلی جاؤں بھیج لیجئے گا ـــ آخر بیزاری کس بات پر ہے۔"

"ڈالڈا کا ٹین پچھلی بار پندرہ روپے کا آیا تھا۔ اب پونے بیس کا ہے۔"

وہ زور سے ہنسی ـــ "اللہ توبہ۔ آپ بھی اب گرستی بننے چلے ہیں۔ آپ کو بھلا ان باتوں سے مطلب؟"

"نہیں تو کیا تمھاری بی جان نوٹوں کا درخت اُگا مینگی ـــ چلو تم اپنی بات کرو کونسی خبر لے کر دوڑی آئیں تھیں۔"

اس نے اخبار پر نظریں جھکائیں۔

"ہمارے وزیر اعظم شاستری جی نے پارلیمنٹ کی

ایک بحث میں فرمایا ہے کہ تقریباً سبھی دیس چاہتے ہیں کہ ہمیں کشمیر کا سوال پُرامن طور پر سلجھانا چاہیئے۔ ہم بھی اسے پُرامن طور پر حل کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ سمجھوتہ باعزت ہونا چاہیئے۔ اگر باعزت نہ ہوا تو ہم اسے قبول نہیں کرسکتے"

"بالکل معقول بات ہے ـــ بے عزت سمجھوتہ تو کوئی دو کوڑی کا ملک بھی پسند نہیں کرسکتا۔"

"اب بنیئے مت ـــ سمجھوتے کا کیا سوال ہے جب شاستری جی کل تک یہ کہتے آئے ہیں کہ کشمیر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اس پر کہیں کسی سے کوئی گفتگو ہو ہی نہیں سکتی۔"

"ضرور کہتے آئے ہیں ـــ کل بھی یہی کہہ سکتے ہیں۔"

"ہائے اللہ۔ کیا مطلب ہوا؟"

"تم بچی ہو۔ سیاست میں کوئی چیز حرفِ آخر نہیں ہوا کرتی ـــ یہ تو ایک شطرنج ہے۔ جو مہرہ ابھی آگے چلا ہے ہوسکتا ہے اسے اگلے منٹ پیچھے ہٹا لیا جائے۔"

اتنے میں ملائن باورچی خانے سے باہر آئیں۔ زبیدہ نے لہک کر کہا:۔

"بی جان ـــ آپ بھی ذرا سنیئے۔"

فرفراس نے پھر وہی فقرے پڑھ دیئے ـــ ملائن مسکرائیں مگر کچھ بولی نہیں۔ بس یہ شعر گنگناتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔

شرما گئے لجا گئے دامن بچا گئے
اے عشق مرحبا وہ یہاں تک تو آگئے

"دیکھا بھائی جان آپنے۔ بی جان کیسا برمحل شعر پڑھ گئیں۔" زبیدہ کھل اٹھی۔

"اس شعر سے غداری کی بو آتی ہے۔ تمھاری بی جان کی کھوپڑی میں اگر گودا ہوتا تو انھیں درد بھرے لہجے میں غالب کی وہ بیت پڑھنی چاہیئے تھی ـــ رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ـــ"

"خدا نہ کرے۔ بھلا اس بیت کا کیا موقع تھا ـــ"

"بس اچھا دماغ نہ چاٹو ـــ"

"میں تو چاٹوں گی ـــ آپ بتایئے اتنے دنوں سے جب چھوٹے بڑے وزیر وزراء بار بار کہتے جا رہے ہیں کہ کشمیر کے سلسلے میں بڑی سے بڑی طاقت کا دباؤ نہیں مانا جائیگا کشمیر کا قصہ تو طے بھی ہو چکا۔ اور ہمارے وزیر اعظم کو شاید یہ بھی پتا ہے کہ روس کشمیر کو ایک نئے انداز میں تقسیم کرانے کا خیال رکھتا ہے پھر وزیر اعظم نے روس جانے پر رضامندی کیوں ظاہر کردی ـــ علاوہ اس کے وہ امریکہ کے جانسن سے بھی کشمیر کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے آمادہ ہیں ....."

نہیں تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ امریکہ اور روس دونوں کو ناراض کردیا جائے ـــ"

"میں کچھ کیوں چاہنے لگی ـــ ہائے اللہ بات تو یہ الجھن کی ہے کہ خود ہماری حکومت کیا چاہتی ہے۔"

"خیریت چاہتی ہے ـــ اگر تمھارے پاس موجودہ گتھی کا کوئی حل ہو تو لاؤ مجھے دو میں تار کے ذریعے اوپر بھجوادوں گا۔"

"خدا آپ سے سمجھے ـــ سوال کچھ جواب کچھ۔ میں کمبخت تو ریحانہ کی بچی سے شرط بھی ہار گئی۔"

"کیسی شرط؟"

"ارے بس کیا بتاؤں ـــ میں تو اخبار دیکھ دیکھ کر سمجھ رہی تھی کہ وزیر اعظم نہ روس جائیں گے نہ امریکہ۔ وہ مکّار کہہ رہی تھی جاکے رہیں گے۔ میں نے کہا ہوگئی وہ دو سیر گلاب جامنوں کی شرط۔"

"پھر تو آؤ دو دو سیر بالوشاہیوں کی شرط مجھ سے بھی بدلو ـــ ہوسکتا ہے ریحانہ کی کسر مجھ سے ہی پوری ہوجائے۔"

"بس بھائی جان کان پکڑے اب تو ـــ کس کا کیا اعتبار رہے۔"

"مایوس کیوں ہوتی ہو۔ عین ممکن ہے وزیر اعظم روس اور امریکہ دونوں سے منہ در منہ کہدیں کہ پنج شیل سے لیکر خمیری روٹی تک ہر مسئلہ پر گفتگو ہوسکتی ہے مگر کشمیر کا مسئلہ بس یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر کو پاکستان کب خالی کرے گا ـــ"

زبیدہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہائے اللہ۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔" وہ اس طرح چہکی

جیسے کوئی رنگین کھلونا ہاتھ آگیا ہو۔" ہمارے وزیر خارجہ نے بھی تو یہی کہا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ اگر کچھ ہے تو بس یہ ہے کہ پاکستان نام نہاد آزاد کشمیر سے اپنا قبضہ ہٹا لے۔"

"کہا تھا نا —— بس تو آؤ اسی نکتے پر شرط ہوئی ——"

"کیوں اسے پاگل بنا رہے ہو" —— دفعتاً ملائن کی آواز آئی۔ وہ کمرے سے برآمد ہو رہی تھی۔

"تو آؤ تم لگا لو شرط" میں نے گردن موڑ کر کہا "یہ تم سے کچھ زیادہ ہی عقل مند ہے ——"

"چلو لگی شرط۔ تم آج ڈالڈا کا ٹین نہیں لاؤ گے۔" ملائن کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"وہ تو میں کل بھی نہیں لاؤں گا —— نکالا چاہتا ہے کام تو طعنوں سے کیوں غالب ۔۔۔۔"

"نہیں لاؤ گے تو ہانڈی بھی نہیں پکے گی —— چل ری ہرے دھنیے کی چٹنی پیس لے۔ ان کا پیٹ تو اب سیاست سے بھرا رہتا ہے"

"خدا سے ڈرو سنگدل —— سیاست کے کیڑے تو تمھاری اس چہیتی کے بھیجے میں کلبلا رہے ہیں۔"

"ہائے اللہ بھائی جان۔ کیا میں بس بی جان ہی کی چہیتی ہوں —— آپ کی نہیں۔"

"میں تیرے کان کھینچ کر گدّی میں لگا دوں گا —— جاؤ تم دونوں میں اس وقت زندگی سے بیزار ہوں۔ بہت ستاؤ گی تو خواجہ آباد چلا جاؤں گا۔"

"بہت جانے دیا اب کی ——" ملائن تڑاخ سے بولی۔

"یہ خواجہ آباد کیا ہوتا ہے بی جان؟" زبیدہ نے استفسار کیا۔

"اری کچھ نہیں —— تو کھڑی ہو یہاں سے۔"

"بھائی جان آپ کو خدا کی قسم۔ یہ خواجہ آباد کی کیا بات تھی۔"

"بس تھی ایک بات —— اپنی بی جان سے بھوانی کی بالوشاہیاں منگوا لو پھر بتاؤں گا۔"

"کیوں بی جان —— منگوا رہی ہیں؟" زبیدہ نے ایسی معصومیت سے پوچھا کہ مجھے ہنسی آگئی مگر ملائن کو تاؤ آیا۔

"خدا ہی تجھے عقل دے —— یہ تجھے اور مجھے سب کو پاگل بنا دیں گے —— آٹا پندرہ آنے کلو مل رہا ہے اور انھیں چٹخارے سوجھ رہے ہیں۔"

"تو چلو آج روٹی مت پکاؤ۔ بالوشاہیوں سے پیٹ بھر لیں گے۔" میں نے مکمل سنجیدگی سے کہا —— "ہمارے وزیر اعظم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ ضروری نہیں دونوں وقت روٹی ہی کھاؤ —— میوے کھاؤ۔ مٹھائی کھاؤ۔ ترکاریاں کھاؤ۔"

"عورتوں کا بھیجا کھاؤ۔" ملائن بھنا گئی۔ "پرسوں سے کہہ رہی ہوں ڈالڈا کا ٹین لے آؤ۔"

"فقط زبان ہلانے سے میری اچھی بیگم اگر ڈالڈا آجایا کرتا تو ہمارے دیس کے ہر گلی کوچے میں گیہوں کے ڈھیر نظر آتے —— اور بھی نہ جانے کیا کیا نظر آتا۔ زبان ہلانے میں تمھارے فرشتے بھی ہمارے نیتاؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے —— لاؤ روپے نکال لاؤ ابھی لاتا ہوں ڈالڈا ——"

"روپے ہوتے تو تمھی سے کیوں سر مارتی —— ادھار لے آؤ ——"

"کہہ تو چکا ہوں۔ دوکانداروں نے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں جب تک فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہیں ادھار بند رہے گا۔"

یہ کل کا قصہ تھا۔ آج پھر زبیدہ نے دیپک راگ چھیڑا

"اور لیجئے بھائی جان۔ آج تو کمال ہی ہو گیا۔" وہ اخبار لئے تیر کی طرح میری طرف آئی۔

"یہ زمانہ ہی کمال کا ہے بے وقوف —— خلا میں پلیٹ فارم بنائے جا رہے ہیں۔"

"اجی نہیں بھائی جان —— میں اور بات دکھا رہی ہوں —— یہ دیکھئے۔"

اس نے اخبار میرے سامنے رکھ کر سُرخی پڑھی:۔

"تاشقند میں دوسرے مسائل کے ساتھ کشمیر پر بھی گفتگو ہو سکتی ہے۔"

اب اس سے نیچے کی سُرخی پڑھئے:۔

"ہر قیمت پر سمجھوتہ ___ لیکن کشمیر پر بات نہیں ہوگی۔"

وہ سوالیہ نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"تم سیاست خانم۔ کشمیر ہی کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔"

"میری پڑے بلا ___ آپ ذرا یہ بتائیے عورتیں کم بختیں تو ناقص العقل ہوتی ہیں۔ یہ کشمیر گفتگو ہوگی اور نہیں ہوگی۔ نہیں ہوگی اور ہوگی بھلا یہ کس قسم کا مردانہ کمالِ عقل ہے۔"

"پہلی سرخی کے نیچے پڑھو کیا لکھا ہے۔"

"یوں لکھا ہے کہ مسٹر شاستری صدر ایوب سے ملاقات سے قبل اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ دونوں ملکوں کے تنازعات زیر بحث لائے جائیں تو مسئلہ کشمیر کو ان مذاکرات میں ایک مد بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن محض نزاع کشمیر پر ہی گفتگو کی جائے یہ نہیں ہو سکتا۔"

"اور دوسری کے نیچے؟"

"یہی کہ ہم پانڈوں کی طرح ہر قیمت پر سمجھوتے کے لئے تیار ہیں مگر کشمیر کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہ کریں گے۔"

"پانڈوں کی طرح ___" میں بڑبڑایا۔ "کوروں پانڈوں کی تاریخ پڑھی ہے تم نے؟"

"نہیں تو ..."

"بس تو شریف بچوں کی طرح جا کے چولھے ہانڈی میں لگو ___ سیاست کو سمجھنے کے لئے اکتالیس علوم و فنون ضروری ہوتے ہیں جن میں سے ایک تاریخ بھی ہے۔"

"آپ نے تو گیارہ بھی نہ پڑھے ہوں گے ___ اعتراف ہی جو کر لیجئے کہ آپ کی عقل بھی اس معمہ کو سمجھنے سے قاصر ہے۔"

"جھک مارتی ہو ___ معمہ کیا دھرا ہے۔ شاستری جی ہمارے سربراہ ہیں۔ وہ امریکہ اور روس میں جو بھی طے کر کے آئیں گے ہم کھلے دل سے تائید کریں گے کہ واہ واہ سبحان اللہ۔"

"آپ کا کیا خیال ہے وہ جھک جائیں گے؟"

"جھکنا نہ جھکنا تو مقدر کے کھیل ہیں ___ کیا پتا کل ہمارے ستارے کیسے ہوں۔ آج بہرحال شاندار ہیں۔"

"دھرے ہیں شاندار۔ قحط تو منھ پھاڑے آ رہا ہے۔"

"کشمیر کے لئے ہم بھوکے بھی لڑیں گے۔"

"لڑیں گے کہاں سے جب وزیر اعظم روس اور امریکہ جا رہے ہیں تو پاکستان سے مصالحت ہو کر رہے گی ___"

"تمھیں یقین ہے؟ ___ آؤ پھر ہو گئی دو دو سیر بالوشاہیوں کی ___"

"چلئے ہو گئی ___ اللہ مالک ہے ___"

(ملّا زندہ صحبت باقی)

اعلانِ رعایت ___ کتابوں کے علاوہ نسخۂ مُصحف میں بھی

رمضان المبارک کی تقریب میں مکتبۂ تجلّی نے فیصلہ کیا ہے کہ آج کے دن سے عید الفطر کے دن تک اپنے خریداروں کو پاکستانی کتابوں پر ایک آنہ فی روپیہ اور ہندوستانی کتابوں پر دو آنہ فی روپیہ کی رعایت دی جائے گی۔ اور ___ دار الفیض رحمانی نے بھی دس نئے پیسے فی روپیہ رعایت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس اعلان سے فائدہ اٹھائیے

منیجر مکتبہ تجلی ___ و ___ منیجر دار الفیض رحمانی۔ دیوبند

جمیل مہدی

آج ــــ اور ــــ کل

اقوام متحدہ کی مجلس تحفظ سے ہندوستانی وفد نے کشمیر کے مسئلہ پر واک آؤٹ کرکے ہندوستان کی ایک نئی پالیسی کا افتتاح کیا ہے۔ ہندوستان کے وزیر خارجہ مسٹر سورن سنگھ یہ کہہ کر مجلس تحفظ سے باہر چلے آئے کہ اقوام متحدہ کو کشمیر کے اندرونی معاملہ پر بحث کرنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ یہ ہندوستان کے ایک صوبہ کا معاملہ ہے جسے ہندوستان اپنے اندرونی معاملے میں مداخلت تصور کرتا ہے ـــ ہندوستان کے اس وفد کے اقدام سے اقوام متحدہ کو ایک غیر معمولی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہے اور دنیا کے سبھی ممالک اور بین الاقوامی سیاست کے سبھی حلقوں میں اس اقدام کے درست یا نادرست ہونے کے بارے میں ایک بحث چھڑ گئی ہے اور ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ بین الاقوامی رائے عامہ پر ہندوستان کے اس اقدام کا اچھا اثر نہیں پڑا ہے اور دنیا کے ممالک اس سیدھے سادے سوال کو ہندوستان سے یہ پوچھ پوچھ کر مزید پیچیدہ بنا رہے ہیں کہ جب ۱۳۲ بار کشمیر کا مسئلہ متنازعہ تسلیم کرکے ہندوستانی وفد نے اسے حل کرنے کی تجویزوں پر مباحثہ میں حصہ لیا ہے تو ایک سو تینتیسویں [۱۳۳] مرتبہ یہ مسئلہ غیر متنازعہ کیسے ہو گیا ـــ ؟

فی الحال ہمیں اس اقدام کے درست یا نادرست ہونے کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ ابھی تک اس اقدام کے ردِ عمل میں کوئی آخری اور قطعی نتیجہ بر آمد نہیں ہوا ہے ـــ کہنے کی بات صرف اس قدر ہے کہ اپنے اہم اور دُور رس اثرات کے حامل اقدام کے بارے میں بھی ہندوستان کے سیاست دانوں اور دانشوروں کے مابین ہم آہنگی اور اتفاق رائے نہیں پایا جاتا اور اس معاملے میں بھی حسب دستور یار لوگوں نے قلم لگانے شروع کر دیئے ہیں۔ مسٹر کرشنا مینن نے جو ابھی چند دن پہلے ہندوستانی حکومت اور وزیر اعظم شاستری کے ذاتی ایلچی کی حیثیت میں مصر اور افریقی دیشوں میں ہندوستان کی پالیسی کی ترجمانی کے لئے گئے تھے۔ بڑے غیر مبہم اور واضح انداز میں وزیر خارجہ سورن سنگھ کے واک آوٹ پر نکتہ چینی کی ہے اور اسے " غلط اور غیر ضروری " قرار دیا ہے ـــ خود ہندوستان کے حلقۂ دانشوران میں اس اقدام کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا گیا اور اس معاملے میں کافی کشیدگی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں پبلک کے سامنے اس اقدام کی دو سے زیادہ مختلف توجیہیں پیش کی جا رہی ہیں۔ جس میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستانی وفد نے مسئلہ کشمیر کے اصل موضوع کے بجائے پاکستانی وزیر خارجہ مسٹر بھٹو کی مبیّنہ گالیوں اور زبان درازیوں کے خلاف احتجاجاً واک آوٹ کیا ہے۔ ـــ جو لوگ واک آؤٹ کی یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں وہ سکیورٹی کونسل کی بھی شکایت کرتے سنے جاتے ہیں کہ ممبروں نے مسٹر بھٹو کو غیر پارلیمنٹری بلکہ غیر شریفانہ الفاظ استعمال کرنے سے نہیں روکا۔ لیکن یہ شکایت کرتے وقت ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ وہ واک آؤٹ کے مسئلہ پر مختلف رائے رکھنے والے

لوگوں کی دلیل میں ایک اور وزن پیدا کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر ہندوستانی دفِ سیکورٹی کونسل کے اندر رہ کر مسٹر بھٹو کی مبیّنہ بدتمیزیوں پر احتجاج کرتا اور اقوام متحدہ کے ممبروں پر اپنا ذاتی اثر ڈالتے ہوئے انھیں مسٹر بھٹو کو ٹوکنے اور ان سے ان کے اس غیر مہذب طرزِ عمل کے بارے میں جواب طلب کرنے پر زور دیتا تو انٹرنیشنل پالٹیکس پر اس کا زیادہ مؤثر عمل ہو سکتا تھا۔ بہر حال اس واک آؤٹ کے بارے میں بھی ہندوستان کی حکومت اپنے ہی اربابِ کار اور ساتھیوں کا مکمل اتفاقِ رائے اور ضمانت حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے اور ہندوستان سیاستدانوں کا یہ باہمی انتشار اور تخالف باہر کی دنیا میں ہندوستان کا وقار اور اہمیت بلند کرنے کے بجائے اسے کمزور کرنے اور گھٹانے کا سبب بن رہا ہے۔

اب اس اختلاف و تضاد کا ذکر آیا تو یہ ماتم بھی کر لیجئے کہ ہندوستان میں حکومت کی کسی بھی پالیسی کو اتنے سخت اور بھیانک دور میں بھی مکمل طور پر قومی تعاون اور ہم آہنگی حاصل نہیں ہو سکی ہے ــــ سیاسی نفسیات کے بڑے سے بڑے ماہروں کی رائے میں جنگ ہی کسی بھی مختلف النوع اور متضاد نظریات میں بٹے ہوئے ملک کو کسی ایک نقطۂ نظر پر لانے اور مکمل طور پر متحد کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ اس نظریہ کی روشنی میں ہندوستان اور پاکستان کی موجودہ خوں ریز جنگ کو ہندوستان کے اندرونی اتحاد کو مضبوط کرنے اور یہاں مکمل طور پر قومی یک جہتی پیدا کرنے کا سبب بن جانا چاہیئے تھا اور ہمارے بڑے سے بڑے سیاستداں اور حکمراں اس کا دعویٰ بھی کر رہے ہیں کہ اس جنگ نے ہندوستان کے ۴۵ کروڑ عوام کو مکمل طور پر متحد اور مضبوط کر بھی دیا ہے لیکن جب ہم اس دعوے کے آثار و علائم کا رات دن مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ سب کچھ ایک مذاق معلوم ہوتا ہے۔ سیاست جیسے سنجیدہ اور فکر آزما موضوع پر کچھ لکھتے ہوئے لفظ "مذاق" کا استعمال عجیب سا ضرور ہے۔ لیکن ہندوستان میں آج کل ہو یہی رہا ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ مسئلہ بار لوگوں کی رنگ برنگی مختلف طبع آزمائیوں میں اخباری مشاعرہ بن کر رہ جاتا ہے اور عوام بیچارے منہ تکتے رہ جاتے ہیں کہ طویل صحبتِ شب کی خمار انگیز انگڑائیوں کے سوا ان کے ہاتھ آیا ہی کیا ـــ!

برطانیہ کی ہندوستان دشمن پالیسی کو مصرعہ طرح بنا کر ایک صاحب نے گرہ لگائی کہ ہندوستان برطانیہ کے ساتھ تعلقات کے بارے میں ایک نئی پالیسی بنائیگا ـــ دوسرے صاحب نے مصرعہ اٹھایا کہ ہندوستان دولتِ مشترکہ کی تنظیم سے علیحدہ ہو جائے گا۔ مسٹر چھاگلہ نے مقطع کہا کہ ہم سب ملکر برطانیہ کو دولتِ مشترکہ سے باہر نکال دیں گے کیونکہ اس تنظیم میں کالوں کی اکثریت ہے ـــ چلئے مشاعرہ ختم ـــ جس طرح مشاعرے کی رات میں سوزِ فراق سے جلتے ہوئے شاعر کو مشاعرہ کی صبح اطمینان سے چائے اور مکھن کھاتے دیکھ کر نفسیاتی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ ایسی ہی الجھن اس وقت عوام کے دل میں پیدا ہوئی جب برطانیہ کے دیئے ہوئے ایک بیش قیمت قرضے کی دستاویز پر ہندوستانی نمائندے کے دستخط ثبت ہو جانے کے بعد وزیرِ اعظم شاستری نے پبلک جلسے میں برطانیہ کی تعریف شروع کر دی کہ بالآخر اس نے بھارت کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر اس کی حمایت کا افتتاح کر ہی دیا ہے۔

خوراک کا مسئلہ ہندوستان کی شہ رگ کے باقی رہنے یا کٹ جانے کا مسئلہ ہے لیکن خیر سے ہمارے رہنماؤں، لیڈروں، حاکموں اور وزیروں نے اسے بھی قافیہ پیمائی کا موضوع اور آسمان میں تھگلی لگانے کی مہم بنا ڈالا ہے۔ شاستری جی کی گملوں، لانوں اور صحنوں میں غلہ اگانے والی اسکیم کے بعد تو اسکیموں، تجویزوں اور ریزولیشنوں

کا ایک طوفان اُمنڈ پڑا ہے۔ کچھ لوگوں کی اسکیم یہ ہے کہ بھوکوں رہ لیا جائے مگر ہاتھ پسارنے کی ذلّت گوارا نہ کی جائے۔ خود وزیرِ اعظم نے سوموار کو ایک وقت کے فاقہ کی نئی اسکیم پیش کردی ہے اور سنا ہے کہ خود ایک وقت بھوکا رہ کر اس اسکیم پر عمل بھی شروع کردیا ہے ــــ کچھ لوگ امریکہ کو نظرانداز کرکے آسٹریلیا اور کنیڈا سے نقد گندم حاصل کرنے کی تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔ سب سے بہتر اسکیم ہندو مہاسبھا کے دانشوروں نے پیش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر سال ہندوستان میں غلّہ کی دس فیصدی کمی پڑتی ہے جبکہ یہاں رہنے والے پانچ کروڑ مسلمان مُلک کا ۱۳ فی صدی اناج کھا جاتے ہیں۔ اس لئے مسئلہ کا سب سے بہتر حل یہ ہے کہ پانچ کروڑ مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال دیا جائے تاکہ دس فی صدی کی کو بھی پورا کرکے ہندوستان مزید ۳ فیصدی فاضل پیداوار حاصل کرکے ان باوقار ملکوں میں شامل ہو جائے جو دنیا بھر میں اناج برآمد کرتے ہیں ــ چلو قصہ ختم ــــ نہ ایک وقت فاقہ کرنے کی ضرورت، نہ کھیتوں، مکانوں، صحنوں اور گملوں میں اناج اُگانے کی مشقت، نہ ہندوستان کا زرِ مبادلہ دوسرے ملکوں میں گیہوں خریدنے پر صرف کرنیکی حاجت نہ امریکہ کے سیاسی دباؤ میں آنے کا امکان۔ گویا پانچ کروڑ مسلمان کاغذ کی کشتیاں ہیں جنھیں ہندوستان والے تفریح کا ایک دن مناکر دریاؤں میں چھوڑ دیں گے اور کامل اطمینان کا سانس لیں گے۔ پھر خوراک کا مسئلہ حل شدہ سمجھو ــ اگر اگر ایسی ہی اسکیموں اور تجویزوں سے یہ لوگ خوراک کے علاوہ دوسرے مسائل کو بھی حل کرنے کی کوشش کریں گے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس ملک کے اصل بُرے دن تو اب شروع ہوئے ہیں۔

حقیقی صورتِ حال تو وہی ہے جیسا کہ ہندوستان کے وزیر خوراک مسٹر سبھرامنیم نے اظہار کیا ہے اور وہ یہ کہ "ہندوستان کی خوراک کی پوزیشن سنگین اور خراب ہوتی جارہی ہے ــ اور ممکن ہے چند دنوں میں نازک صورت حال کا سامنا ہو جائے۔" مسٹر سبھرامنیم نے ہندوستانی عوام سے جذبۂ حب الوطنی کے نام پر اپیل کی ہے کہ وہ بدتر حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے گھبرائیں نہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ پی ایل ۴۸۰ کے ماتحت ملنے والی خوراک کے غیر یقینی ہوجانے کے باعث خوراک کی تقسیم اور اس سے متعلق پوری پالیسی کی بنیاد بدل گئی ہے۔ ہماری رائے میں "بنیاد بدل گئی ہے" والے فقرے کو "بنیاد ہی ہل گئی ہے" میں تبدیل کرکے صورتِ حال کا زیادہ قریب الفہم اظہار کیا جاسکتا ہے۔!

حاصل کلام یہ کہ ہندوستان کے وزیر خوراک کے الفاظ میں تو ہندوستان بدتر حالت کے کنارے آپہنچا ہے اور ہندوستان کے لیڈر عوام کے سامنے الفاظ کی رنگین مہتابیاں چھوڑ رہے ہیں۔ سنجیدگی اور تدبر پر جذباتیت اور سطح بینی چھائی ہوئی ہے۔ اہم ترین اور پیچیدہ تر مسائل کو مکمل قومی سطح پر حل کرنے کی مخلصانہ جدوجہد کے عوض نعروں، تقریروں اور خوش گپیوں کی بھرمار ہے۔ جوالامکھی کے دہانے مٹی سے لیپے جارہے ہیں۔ کھوکلی دیواروں پر رنگ روغن کیا جارہا ہے۔ کوئی پروا نہیں کہ جوالامکھی کے بطن میں اونٹتا ہوا لاوا جب اُبلے گا تو چمن اور اہل چمن کی عافیت کہاں مُنھ چھپاتی پھریگی۔

پی ایل ۴۸۰ کا تذکرہ آگیا ہے تو ایک اور نقطۂ نظر سے ہندوستان کی معیشت اور اقتصادیات کا جائزہ لیتے چلئے۔ پچھلے سترہ برسوں سے یہی ہوتا آیا ہے کہ ہندوستان کے لیڈر مغربی سیاست دانوں کے دامِ ہم رنگ زمین کے قدم قدم پر شکار ہوتے گئے ہیں ــ کشمیر کا مسئلہ ہو یا رن آف کچھ کا۔ نہری پانی کا، یا نہری پانی کا، یا بیرونی ملکوں سے ہتھیار حاصل کرنے کا، ہندوستان کی بین الاقوامی تجارت کا مرحلہ ہو یا خوراک حاصل کرنے کا مسئلہ، ہم وقتی ضروریات کے ماتحت مغربی شاطروں کی ہر طرح سوچی سمجھی، مربوط اور دُوررس نتائج کی حامل ہر پالیسی کو بظاہر بے ضرر سمجھ کر قبول کرلیتے ہیں اور جب تھوڑے دنوں میں یہ پالیسی اپنے

برگ و بار لانے شروع کرتی ہے تب ہمیں اس کی اصل اہمیت اور خطرے کا احساس ہوتا ہے۔ ہم خوف اور گھبراہٹ میں اس جال سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جال کا ہر حلقہ اتنی ہوشیاری اور مضبوطی سے ترتیب دیا گیا ہے کہ تڑپنے، پھڑکنے چیخنے چلّانے، غیظ و غضب کا اظہار کرنے اور دھمکیاں دینے کا فائدہ کوئی نہیں۔ ہمیں تھک ہار کر کرنا وہی پڑے گا جو ایسے بے بس مگر آزادی پسند پرندہ کو کرنا پڑتا ہے جو ایک ہوشیار شکاری کے جال میں پھنس گیا ہو ــــ مثال کے طور پر یہی پی۔ ایل ۴۸۰ کا معاہدہ ــــ

ہندوستان کے پہلے پنج سالہ پلان کو مکمل طور پر عظیم صنعتوں، بڑے بڑے ڈیموں، پلوں، سڑکوں اور ڈیفنس کے سامان خریدنے پر صرف کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ بے توجہی کا شکار ہو کر رہ گیا اور ہندوستان کو ایک عظیم مقدار میں اناج درآمد کرنے کی فوری ضرورت پیش آئی۔ ۷۰، ۸۰ لاکھ ٹن غلہ درآمد کرنے کے باعث ہندوستان کے محفوظ اسٹرلنگ سرمایہ پر ناقابل برداشت بوجھ پڑا تو ہندوستان کے ارباب اقتدار کو ہندوستان کی بین الاقوامی ساکھ اور خود ہندوستان کی اندرونی اقتصادی بنیاد کے زیر و زبر ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ــــ بھی امریکہ کے عیّار سیاستدانوں نے صرف ہندوستان کی اقتصادیات کو اپنا نشانہ بنا کر امریکی سینیٹ سے ایک بل منظور کرا لیا جو پی ایل سلسلے کا ۴۸۰ واں بل ہے۔ اس بل کے ماتحت امریکی حکومت کو اجازت دیدی گئی کہ وہ اگر چاہے تو اس بل کے تحت کسی بھی ملک میں گیہوں فروخت کر کے اس کی قیمت اسٹرلنگ سکہ کے بجائے وہیں کے سکہ میں وصول کر سکتی ہے۔

ہندوستانی لیڈروں کو جو اپنے محفوظ زر مبادلہ کی روز افزوں کمی سے تشویش مند اور ہراساں تھے امریکہ کی یہ پیش کش نعمتِ غیر مترقبہ معلوم ہوئی کہ وہ ہندوستان کو فروخت کئے جانے والے گیہوں کی قیمت سونے کے بجائے ہندوستانی نوٹوں میں وصول کرے گا۔ زر مبادلہ کے تحفظ کا یقین ایک لاسہ تھا جسے دیکھ کر ہندوستانی لیڈر فوراً پھیلے ہوئے جال پر اُتر آئے انھیں اس وقت یہی نظر آیا کہ امریکہ نے ہندوستانی جمہوریت کو بچانے بلکہ اس کی امداد کرنے کے جذبہ سے یہ قانون منظور کرایا ہے تاکہ ہندوستان اپنی معیشت کو سنبھال کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے، لیکن اب جبکہ کشمیر کے معاملے پر امریکہ اور برطانیہ کی یکساں پالیسی کے باعث ہندوستان میں اضطراب پیدا ہوا اور امریکہ نے گیہوں کی غیر ملکی خریداری امریکہ کے محکمۂ زراعت سے چھین کر امور خارجہ کی وزارت کے حوالے کر دی تو ہندوستانی لیڈروں نے پہلے پہل یہی سمجھا کہ وہ امریکی گیہوں امریکی شرطوں پر نہیں خریدیں گے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ کچھ تکلیف برداشت کر لیں گے۔ اسی بنیاد پر وزیر اعظم شاستری نے امریکہ کے مجوزہ دورے کے امکان پر ایسے خیالات ظاہر کئے جن سے معلوم ہوتا تھا گویا وہ ہندوستان کے وقار کے منافی کسی اقدام پر رائے زنی کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے ارباب حکومت اور پارٹی لیڈروں نے بھی آنکھ بند کر کے شور مچانا شروع کر دیا کہ امریکہ گیہوں نہیں دینا چاہتا تو نہ دے۔ ہم امریکہ کی کوئی شرط منظور نہیں کریں گے اور جب ہمیں امریکہ کی کوئی شرط ہی منظور نہیں تب ہندوستان کے وزیر اعظم کا امریکی دورہ ایک بے فائدہ اور فضول پریشانی سے زیادہ کیا معنی رکھتا ہے؟ اس لئے شری شاستری کو امریکی شرطیں ماننے کے بجائے وہاں جانے ہی سے انکار کر دیا جائے ــــ لیکن استقامت، پامردی، جرأت اور مقابلہ کرنے کے سارے جذبات گھبراہٹ، پریشانی، اضطراب، فکر اور خوف میں تبدیل ہو گئے جب طیور کی زبانی یہ اُڑتی سی خبر سنی گئی کہ مزید کشیدگی کی صورت میں امریکہ ہندوستان میں اپنی وہ ساری کرنسی بھی واپس لینے کی کوشش کرے گا جس کا وہ اپنے گیہوں کی قیمت کی شکل میں مالک ہو چکا ہے۔ تب ہمیں اندازہ ہوا کہ ہندوستان میں چلت کرنسی کا تقریباً چالیس فیصدی یا اس سے زیادہ

حصہ امریکہ کے قبضے میں ہے اور اگر امریکہ اس کرنسی کو اپنے قبضے میں لے لے تو ہندوستان کا اقتصادی ڈھانچہ سارا کا سارا زمین پر دھڑام سے آرہے گا۔

نتیجہ یہ ہے کہ امریکی سفیر شاستری جی کے سفرِ امریکہ کی ساری تفصیلات طے کر رہا ہے۔ چند شرطیں مان لی گئی ہوں تو تعجب نہیں چند شرطوں پر مزید بحث کی جارہی ہے، اور شاستری جی نے کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کی میٹنگ میں کسی حد تک ناگوار انداز میں بالآخر اعلان کر دیا ہے کہ ان کا دورۂ امریکہ اب ضروری ہو گیا ہے اور وہ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں امریکہ ضرور جائیں گے۔ اس لئے ہمیں باہر کی باتوں اور ظاہری پریشان حالیوں کے تذکروں سے قطع نظر کرتے ہوئے اس بات سے مطمئن ہی رہنا چاہئیے کہ ہندوستان کو غلّہ کی کسی کمی اور قحط کے کسی امکان کا سامنا کرنا پڑیگا موجودہ صورت میں جب کہ ہندوستان اور امریکہ ایک دوسرے کو رضامند کرنے میں تقریباً کامیاب ہی ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کو دیئے جانے والے غلّے میں کمی کئے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہفتہ وار بلٹز نے حکومت اور ہندوستان کے "پالیسی میکرز" کے باہمی اختلافات پر جو اظہار خیال کیا ہے وہ واقعتہً ایک انکشاف کا حکم رکھتا ہے۔ بلٹز کا کہنا یہ ہے کہ مرکزی کیبنٹ میں افہام تفہیم اور ہم آہنگی کی کوئی صورت تو کجا باہمی تعلقات میں اخلاقی قدروں تک کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے ــــ اس کے بیان کے مطابق مسٹر کرشنم اچاری اور مسٹر نندہ، مسٹر سنجیوا ریڈی اور کرشنم اچاری، پروفیسر ہمایوں کبیر اور شری چھاگلہ کے درمیان باہمی کشیدگی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ یہ لوگ آپس میں بات چیت تک کے روادار نہیں۔ پچھلے دنوں سے شری لال بہادر شاستری نے ہفتے میں ایک وقت اناج بچانے کی جو اسکیم شروع کر رکھی ہے اس کے متعلق شریمتی لکشمی پنڈت نے میرٹھ میں کہا:۔

"یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہفتے میں ایک وقت کے فاقے کی اسکیم سے ملک کو اناج کے سنکٹ سے بچایا جاسکتا ہے کیونکہ غریب لوگ جن پر ہندوستان کی نناوے فیصدی آبادی مشتمل ہے دن میں ایک وقت ہی کھانا کھاتے ہیں۔"

ہندوستان کے وزیر خوراک شری سبرامنیم نے پبلک طور پر شکایت کی کہ :۔

"خوراک کا مسئلہ اس وقت تک حل نہیں کیا جاسکتا جب تک مرکزی وزارتوں میں باہمی طور پر تعاون اور ہم آہنگی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت حال یہ ہے کہ ہر وزیر اپنی وزارت کو ایک مستقل سلطنت سمجھتا ہے اور اس کا روادار نہیں کہ کوئی دوسرا اس کی حدود میں مداخلت کرے۔"

جب باہمی غیر آہنگی، عدم تعاون اور اختلافات و انتشار کا یہ عالم اس ہنگامی اور جنگی حالت کے زمانے میں ہے تو نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ کو ہندوستانی لیڈروں کی یہ باہمی کش مکش اور ایک دوسرے کو پبلک طور پر خطاوار اور قابل مذمت ٹھیرانے کا یہ جذبہ ہندوستان کو کدھر لے جائے گا۔

تجلّی

ان خوبصورت اور تیکھے سیاسی اشارات پر دو باتیں کہنے کو ہمارا بھی جی چاہتا ہے۔

ایک یہ کہ سیاسی نفسیات کے ان ماہروں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ جنگ کسی متضاد نظریات رکھنے والے ملک کو مکمل طور پر متحد کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔

اتحاد ایک ایسی چیز ہے جو قوموں کے اندر سے ابھرتی ہے۔ جس اتحاد کی جڑیں قومی شعور کے عوض خارجی حالات

میں ہوں وہ حقیقی، مکمل اور دیرپا نہیں ہو سکتا۔ جنگ بہر حال ایک "حادثہ" ہے جو خارج میں واقع ہوتا ہے۔ ایک عبوری دَور جو قوموں کی زندگی میں طوفان کی طرح آتا ہے اور گذر جاتا ہے۔ اس کی دبیز رو میں فکر و نظر کے رنگا رنگ اختلافات دب تو جاتے ہیں مگر ختم نہیں ہو جاتے ۱۹۶۲ء میں چین سے تصادم ہوا تھا اس وقت بھی ہمارے پڑھے لکھے رہنماؤں نے یہی مژدہ سنایا تھا کہ جس قومی یک جہتی کی شدید ضرورت عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی وہ جنگ کے صدقے خود بخود حاصل ہو گئی ہے اور آج پاکستان سے تصادم کے دَور میں بھی یہی مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ مگر علم النفس نے اس پر پہلے بھی قہقہہ لگایا تھا اور آج بھی لگا رہا ہے۔

غور کیا جائے تو جنگ کے زمانے میں عارضی اور سطحی اتحاد اُس اتحاد سے مختلف نہیں ہوتا جو انسانوں اور موذی جانوروں تک کے درمیان اس وقت نمودار ہو جاتا ہے جب وہ کسی بڑے طوفان سے پناہ لینے کے لئے اونچی پہاڑی پر جمع ہو جاتے ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ سیلاب کی زد میں آئے ہوئے ایک درخت پر آدمی اور سانپ دونوں جمع ہیں مگر سانپ ڈسنا بھول گیا ہے!

اس عارضی یک جہتی اور مصالحت کو جواز آپ شوق سے اتحاد کہہ لیں مگر حقیقتہً یہ ایک وقتی مفاہمت ہوتی ہے جو مشترکہ خوف اور مشترکہ جذبۂ تحفظ کی نفسیات سے خود بخود اُبھر آتی ہے۔ سیلاب گذر جائے گا تو سانپ پھر اپنی سرشت اور عادت پر لوٹ آئے گا اور درندے دُھڑ دُھڑی لے کر پھر چیر پھاڑ کا شغل شروع کر دیں گے۔

قومی سطح کے حقیقی اور ٹھوس اتحاد کا مدار در اصل ایسے عوامل پر ہے جنھیں زمانۂ امن ہی کی مسلسل اور مخلصانہ کوششوں کے ذریعہ نشو و نما دیا جاتا ہے۔ اگر کسی ملک کے قومی افکار زمانۂ امن میں ان عوامل کی تھوڑی سی پونجی رکھتے ہوں تب یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنگ ان عوامل کو فوری اور غیر معمولی قوت دے کر قومی اتحاد کی فصل بہار لا سکتی ہے۔

اس تجزیہ کی سان پر ہمارے دیس کو کَس کر دیکھئے تو مایوسی اور صدمے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ یہاں زبانی جمع خرچ بہت ہے۔ نعرے بہت ہیں۔ اصطلاحات بہت ہیں۔ غرّہ، تفاخر اور طنطنہ بہت ہے لیکن قومی یک جہتی کے لئے کوئی متین اور مشترکہ فکری بنیاد موجود نہیں ہے۔ انسانی مساوات اور آدمیت کے احترام کا جذبہ قومی یک جہتی کی عمارت کے لئے خشتِ اوّل کا درجہ رکھتا ہے خصوصاً جہاں بہت سے مذاہب اور گوناگوں متصادم عقائد موجود ہوں وہاں تو اس جذبے کے بغیر یک جہتی اور اتحاد کے رُخ پر دو قدم بھی نہیں چلا جا سکتا مگر یہاں یہ جذبہ قرنوں کی جامد روایات کے سامنے دم بخود ہے۔ اس جذبے کی جگہ یہاں ایک جھول احیائی ذہنیت جبڑے پھیلائے کھڑی ہے جو تشدد اور جارحیت کے نکیلے دانتوں سے رواداری اور مساوات کو چباڑ الناچاہتی ہے۔ اس دیس میں گاندھی جی جیسا رہنما اس لئے قتل کر دیا گیا کہ وہ فرسودہ روایات اور قدیم تنگ نظری پر جمے رہنے کا مخالف تھا۔ یہاں ننھے بچوں کو تعصب نفرت اور توہمات سے لبریز من گھڑت کہانیاں تاریخ اور روایات کے نام سے پڑھائی جاتی ہیں۔ یہاں انصاف اور اخلاق کو ظلم اور بد اخلاقی سے تمیز کرنے کے لئے کوئی ایسا پیمانہ اور معیار موجود نہیں جس پر اتفاق رائے ہو سکے۔ یہاں غضب یہ ہے کہ موروثی تصورات کا سہارا لے کر آدمی آدمی کو اچھوت سمجھتا ہے اور اسی لئے اتحاد اور یک جہتی کا کوئی ایسا مفہوم یہاں موجود ہی نہیں ہے جس کے دائرے میں پوری قوم یکساں طور پر سما سکے۔ پھر بھلا ایسے ملک میں ایک جنگ تو کیا دس جنگیں بھی حقیقی اور مکمل اتحاد کو جنم کیونکر دے سکتی ہیں۔

اور دوسری بات ہم امریکی غلّے کے بارے میں کہنا چاہتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک خوش خبری ہے کہ امریکہ کی طرف سے ہندوستان کو دیئے جانے والے غلے میں کمی کئے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مگر کیا سچ مچ یہ خوش خبری ہے؟!

ہم تو اسے خوش خبری نہیں کہہ سکتے - امریکہ اس پر تُلا ہوا ہے کہ کشمیر کے بارے میں ہمیں ہمارے اس موقف سے ہٹا دے جس کی گردان ہم حالیہ ایام میں زور شور سے کر رہے ہیں - تو کیا امریکی گیہوں کے سرخ دانوں پر ہم اپنے قومی وقار اور خودداری کی بازی ہار جائیں گے - کیا سچ مچ ایسا ہو سکتا ہے کہ دو تین مہینوں تک ہم کشمیر کو اپنا داخلی معاملہ کہتے رہیں اور پھر دفعتاً امریکہ پہنچ کر کسی نئی اسکیم کے آگے گھٹنے ٹیک دیں - خدا کی پناہ - ایسا اگر ہو گیا تو اسے شکست نہیں شکستِ فاش سے بھی بدتر کوئی عنوان دینا ہوگا - کشمیر کا ایک ایک حصّہ ہمارا ہے - پاکستان سے کشمیر کے مسئلے پر کسی مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پوری دنیا زور لگا لے پھر بھی کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ رہیگا امریکہ اور برطانیہ اگر پاکستان کی حمایت کرتے رہیں گے تو انھیں بھی ہم دُور سے سلام کریں گے — یہی سب ہمارے بہادر وزیرِ اعظم، جری وزیرِ خارجہ، دلیش بھگت نیتا اور سیاستداں ڈنکے کی چوٹ کہتے جا رہے ہیں - کیا پھر بھی یہ ممکن ہے کہ امریکہ کے کسی دباؤ یا مکر و فریب سے اپنے اس دو ٹوک موقف میں ہم ہیر موتبدیلی قبول کرلیں اگر نہیں تو کیا امریکہ پاکستان نوازی سے باز آجائیگا - کیا ہم یہ امید کریں کہ جانسن ہمارے وزیرِ اعظم کو امریکہ فقط یہ سنانے کے لئے بلا رہے ہیں کہ امریکہ کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ تسلیم کرتا ہے -

یہی سنانا ہوتا تو اس کے لئے دوسرے ذرائع کچھ کم نہیں تھے - ہمارا تو خیال ہے کہ بھارت اور امریکہ کی باہمی رضامندی کا یقین ابھی قبل از وقت ہے - جھکنے کے عوض ہمیں خوف زدہ لہجے میں کہنا چاہئے کہ آنے والا دسمبر ہماری قومی حمیت، خودداری اور نیک نامی کے لئے آزمائش کا ایک عظیم لمحہ لے کر سامنے آ رہا ہے جس کی شدید گرفت دنیا کو یہ فیصلہ کرنے کا موقع دیگی کہ ہمارے تقریر پیشہ، بلند بانگ اور دلیر حکمرانوں کے بازو زیادہ مضبوط ہیں یا امریکہ کا گیہوں! - ابھی سے اگر ہم یوں کہتے ہیں کہ امریکی غلّے کی تشریف آوری میں کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو یہ ایک دہشت ناک پیش گوئی ہوگی جس سے خوش ہونے کا نہیں خوف کھانے کا محل ہے - واللہ اعلم بالصواب -

---

فتاویٰ عالمگیری

شرعی مسائل کی اس مستند اور مشہور کتاب کا اُردو ترجمہ دُو ماہی قسطوں میں چھپ رہا ہے - پانچ قسطیں چھپ چکی ہیں - فی قسط دُو روپے ۲۵ پیسے - ڈاک خرچ ایک روپیہ - اگر آپ ایک روپیہ فیس داخل کر کے اس سلسلے کے ممبر بن جائیں تو ہر قسط آپ کو ڈاک خرچ معاف کر کے بھیجی جائے گی - اب تک پانچ قسطیں چھپ چکی ہیں -

نورالدرایہ — شرح ہدایہ

ھدایہ فقہ حنفی کی بنیادی کتاب ہے - اس کا بھی اُردو ترجمہ دُو ماہی قسطوں میں چھپ رہا ہے - فی قسط دُو روپے نو قسطیں چھپ چکی ہیں - ایک روپیہ فیس داخل کر کے ممبر بن جائیں تو ہر قسط کا ڈاک خرچ ہمارے ذمے رہے گا -

صراطِ مستقیم | حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی مشہور کتاب - عمدہ لکھائی چھپائی اور دلکش گرد پوش کے ساتھ - ساڑھے تین روپے -

کلیاتِ امدادیہ | اہل دل کے لئے یہ کتاب محتاج تعارف نہیں - اس کا تازہ ایڈیشن بڑے رکھ رکھاؤ سے چھپا ہے - ساڑھے تین روپے -

اشرف السوانح | حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ کی ایک اچھی سوانح - اہل ذوق کے لئے دلکش تحفہ - قیمت دو روپے -

مسئلہ سود | حضرت مفتی محمد شفیع کے قلم سے "سود" کے مسئلہ پر مفصّل بحث - قرآن و حدیث کی روشنی میں - ایک روپیہ ۲۵ پیسے

مکتبہ تجلّی - دیوبند

فاسفیٹس FHASFETS پیشاب میں کچی غذا آنا

ڈاکٹر پیشاب میں ملکہ کچی غذا آنے کو فاسفیٹس آنا بولتے ہیں۔ معدہ کی کمزوری سے جب غذا پوری ہضم نہیں ہوتی تو غیر منہضم غذا پیشاب میں ملکہ خارج ہوا کرتی ہے۔ پیشاب گاڑھا گاڑھا دودھ یا چونہ کی طرح سفید آیا کرتا ہے۔ صاف شیشی میں رکھا جائے تو تھوڑی دیر بعد شیشی کی تہہ میں سفید دانہ دار گھی کی طرح غذا غیر منہضم بیٹھ جاتی ہے۔ مریض اس سفیدی کو اور ہی مادہ سمجھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ چوری چھپے علاج کراتے پھرتے ہیں۔ اناڑی نیم حکیم اور لالچی معالج اندھا دھند سفوف اور معجون وغیرہ استعمال کراتے ہیں جن کی وجہ سے معدہ اور جگر کا فعل اور زیادہ بگڑ جاتا ہے بجائے کم ہونے کے فاسفیٹس اور زیادہ مقدار میں آنے لگتے ہیں۔ مریض روز بروز کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اس مرض کے دفعیہ کی درست تدبیر یہ ہے کہ معدہ و جگر کے فعل کو مقوی معدہ و جگر دونوں کے ذریعہ قوی کیا جائے اور حتی الامکان دماغ اور جسم کو زیادہ سے زیادہ سکون پہنچایا جائے۔ **غذا** زود ہضم اور سادہ استعمال کی جائے ہر نوالہ کو اچھی طرح چبایا جائے۔ کھانا خوب بھوک محسوس ہونے پر کھائیں اور تھوڑی بھوک رہنے پر ہاتھ کھینچ لیں۔ کھانا کھانے کے آدھ گھنٹہ بعد تک کام سے اپنے کو دور رکھیں اگر دماغ کو سکون نہ پہنچایا تو یہ مرض دور نہ ہوگا — اگر خدانخواستہ آپ اس مرض میں یا کسی بھی اور مرض میں مبتلا ہیں تو اپنا مفصل حال مندرجہ ذیل پتہ پر لکھ کر مشورہ لے سکتے ہیں مفید مشورہ دیا جائے گا۔ جواب کے لئے لفافہ یا کارڈ بھیجئے۔

بیگم حکیم محمد عظیم زبیری۔ امروہہ۔ ضلع مراد آباد